سفرنامہ

گامزن

اٹلی کی جانب

عشرت معین سیما

سفرنامہ

اٹلی کی جانب

گامزن

مصنفہ

عشرت معین سیما

مصنف کی اجازت کے بغیر شائع نہیں کیا جا سکتا۔
اگر اس قسم کی کوئی صورت حال ظہور پذیر ہوئی تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے۔
تمام تصفیہ صرف ضلعی عدالت برلن اسٹیگلٹز کے ذریعے ممکن ہے۔

نام کتاب: اٹلی کی جانب **گامزن**
مصنفہ: عشرت معین سیما
اشاعت اول: فروری 2015ء

سرورق: زاہد علی خان
تعداد: 500
طابع: ZAKCOM
+92-300 8224645
www.zak.com.pk

قیمت پاکستان: 350/= روپے
قیمت جرمنی: 5/= یورو

انتساب

شریکِ حیات سید انور ظہیر رہبر

اور

سرمایۂ حیات سارہ، مایا کے نام

عشرت معین سیما کی اُردو ادب کی دنیا میں متنوع کارکردگی

کسی کے ذکر کا جب ہم ارادہ رکھتے ہیں
ہمیشہ ہم کوئی تصویر سادہ رکھتے ہیں
جو چاہے آئے محبت کے پھول لے جائے
ہم اہل خیر بہت دل کشادہ رکھتے ہیں

عشرت معین سیما پر کچھ لکھنے کے لیے صرف دل کشادہ رکھنے سے ہی کام نہیں چلے گا بلکہ اسکے لیے ذہن، سوچ اور لفظوں کے چناؤ کو بھی بہت کشادہ رکھنا ہوگا کیونکہ انکی ہمہ گیر شخصیت پر کچھ قلم بند کرنا مجھ ناچیز کے لیے کچھ آساں نہیں ہے۔ یہ کام میرے لئے اور بھی زیادہ مشکل ہوجاتا ہے جب ایسی شخصیت کے بارے میں لکھنا مقصود ہو جو پہلے ہی سے دل و دماغ کے بہت قریب ہو۔ عشرت معین سیما نام تو ایک

ہی شخصیت کا ہے لیکن اس ایک نام کی شخصیت کی ان گنت پہچان ہے، آپ نہ صرف ایک شاعرہ ہیں بلکہ ایک افسانہ نگار، ایک کالم نویس، ایک بہت بہترین مقرر کے علاوہ آپ کی آواز میں بھی بلا کا جادو ہے، جو کہ انکے ترنم سے پڑھی جانے والی نظموں اور غزلوں سے بہت خوب واضع ہے۔

پیشے کے اعتبار سے عشرت ایک صحافی ہیں اور جرمن اخبار، ریڈیو، ٹی وی سے منسلک ہونے کے ساتھ ساتھ بی بی سی ریڈیو، جنگ اخبار اور جیوٹی وی پر بھی اپنی صحافت کی جھلک دیکھاتی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ جو بات انھیں بہت منفرد بناتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک پاکستانی ہونے کے باوجود انکو ہندی زبان پر مکمل دسترس حاصل ہے اور یہ نہ صرف اردو بلکہ ہندی زبان کی تربیت یافتہ مترجم کا بھی کام انجام دیتی ہیں ۔ برلن کی یونیورسٹی کے شعبہ ءلسانیات کے ایک محقق کے ساتھ ساتھ اردو اور ہندی زبان کی استاد بھی ہیں۔ آپ جرمنی، امریکہ اور یورپ میں جس میں اٹلی، برطانیہ اور دوسرے ملک شامل ہیں، کی یونیورسٹیوں میں پرائیوٹ لیکچرار کے طور پر لیکچر دے رہی ہیں اور یورپی ممالک کے لوگوں کو یورپی ممالک کی زبانوں اور زبان اردو سے رشتے اور ناطے کو جوڑنے کا ہنر سکھا رہی ہیں۔

جس طرح عشرت کی شخصیت کے اتنے پہلو ہیں اسی طرح انکی شاعری بھی مختلف پہلوؤں سے بھری پڑی ہے۔ عشق اور محبت کے پودے سے جنم لینے والی شاعری نسوانیت اور حالات زندگی اور دنیا کے بوسیدہ رسم ورواج کے خلاف بغاوت، وقت کی بے رحمی، سیاسی اور جنگی حالات کی تکلیف میں پروئی ہوئی شاعری بن چکی ہے، اسکے باوجود انکی شخصیت میں جو بذلہ سنجی رچی بسی ہے اسکی جھلک بھی اکثر بہت واضح طور پر پڑھنے والے کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتی رہتی ہے۔

عشرت رہتی تو جرمنی میں ہی ہیں لیکن شائید ہی کوئی ایسا پل ہو جس میں انکا رشتہ ورابطہ اپنے وطن کی مٹی سے، اپنے بہن بھائیوں، دوستوں سے کچھ ہی دیر کے

لیے بھی منقطع ہوا ہو اسی لیے وطن میں ہونے والے ہر ایک لمحے میں ہونے والی تبدیلی انکو پکار پکار کر اپنی جانب کھینچتی رہتی ہے اور وہ درد میں ڈوب کر خوب لکھتی رہتی ہیں جو صرف ان ہی کے قلم سے ڈھل سکتی ہیں۔

رہے پابند ہم لفظ و دہن کے
عجب انداز تھے ایکے وطن کے
فضا میں گولیاں چلا رہی تھیں
مہکتے پھول کملائے چمن کے

نہ صرف شاعری میں وطن کی دوری انھیں قلم اٹھانے پر مجبور کرتی ہے بلکہ یہ موضوع انکے افسانوں میں بھی خوب نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کے انکے افسانے موجودہ افسانوں کی دنیا میں ایک خوبصورت اضافہ ہیں۔ آپ کے افسانوں میں پریم چند اور عصمت چغتائی کا رنگ نہایت واضح ہے۔ اچھی تحریر بناء مطالعہ کے وجود میں نہیں آسکتی اور یہی وجہ ہے کہ عشرت نے اپنا مطالعہ بہت وسیع رکھا ہوا ہے اور اپنی تحریروں میں معاشرے اور روزمرہ کی زندگی کو موضوع بنا کر اسکی درستگی کے لیے بے چین نظر آتی ہیں۔ برلن کی کوئی بھی ادبی محفل ایسی نہیں ہوتی جو عشرت کے بغیر مکمل ہو، اب برلن ہی نہیں بلکہ جرمنی کے دوسرے شہروں، یورپ کے کئی ملکوں اور پاکستان میں بھی انکا کلام اور افسانہ نہایت شوق سے پڑھا اور سنا جاتا ہے۔ برلن سے شائع ہونے والا رسالہ نئی کاوش انکی زیرِ نگرانی نکلتا رہا ہے اور ادبی حلقے میں بڑی پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔ یہ سفرنامہ دراصل اُن کی ڈائری کے کچھ خاص صفحات ہیں جو انہوں نے بیرونِ جرمنی اپنے ڈاکٹریٹ کے تحقیقی پروجیکٹ کے سلسلے میں وہاں رہتے ہوئے قلم بند کیے تھے۔ عشرت معین سیما زندگی میں وقوع پزیر ہونے والے چھوٹے

بڑے اہم واقعات کو اپنی تحریروں میں ضرور قلم بند کرتی ہیں کبھی کسی شعر کی صورت میں اور کبھی کسی افسانے کے موضوع میں۔ اردو ادب میں سفرنامے کی سرزمین پر یہ ان کا پہلا قدم ہے اور مجھے یقین ہے کہ ابھی انھیں اردو ادب کا بڑا لمبا سفر کرنا ہے جس کے لیے میری دعا ہے کہ میں بھی انکے اس سفر میں اور زندگی کے ہر سفر میں انکے ساتھ چلتا رہوں انکے قدم سے قدم ملا کر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آمین۔

انور ظہیر رہبر
(نائب صدر اردو انجمن برلن جرمنی)
Gotenstr 33
10829 Berlin
Germany

سفر ہے شرط ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ثروت عصمی

بیج کس نے بو دیئے مجھ میں مسافت حسن کے
چلنا سیکھا تھا کہ پاؤں میں سفر آنے لگے

یہ شعر نہ جانے کس کا ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ سیما نے چلنا سیکھنے سے قبل ہی اپنے سفر کی ابتدا کر دی تھی۔ ننھیال مشرقی پاکستان میں تھا اور ددھیال مغربی پاکستان میں۔ مگر یہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے سفر زندگی کے ابتدائی دو تین سالوں تک ہی رہے کیونکہ مشرقی پاکستان جب بنگلہ دیش بنا تو سارا ننھیال وہاں سے ہجرت کر کے پاکستان آ گیا۔

اب سفر کے راستے سمٹ گئے تھے اندرونِ ملک ہی نہیں بلکہ اندرونِ سندھ تک سمٹ گئے تھے۔ عمر کے ساتھ ساتھ جب یہ سلسلے بڑھے تو سفر بھی طوالت پکڑنے لگے اور ایک دن ایک رہبر کا ہاتھ تھامے سیما پاکستان سے جرمنی کی جانب یہ کہتے ہوئے چل دیں کہ:

مجھے منزل نہیں بس ایک راہ رو کی ضرورت ہے
سفر کے رنگ سارے راستوں کے ساتھ ہوتے ہیں

اس کتاب کے آغاز میں وہ لکھتی ہیں کہ یہ اُن کا پہلا سفر نامہ ہے۔ جب کہ میرے لئے یہ اُن کا یہ پہلا سفر نامہ نہیں ہے میرے پاس اُن کے کئی طویل خطوط ہیں جو انہوں نے جرمنی، لندن، شکاگو، استنبول، سعودی عرب، مسقط، سوئیزرلینڈ، برسلز، پولینڈ اور نہ جانے کہاں کہاں سے لکھے ہیں۔ سیما جب ان ملکوں کی سیر

کرنے نکلتی ہیں تو اپنی نظروں میں تو وہ تمام مناظر سموتی ہی ہیں مگر ان کو اپنے تجربات کی روشنی میں جب تحریری طور پر بیان کرتی ہیں تو لگتا ہے کہ آپ بھی اُن کے ساتھ اس شہر کی گلیوں کوچوں میں سرگرداں ہیں۔ میرے لئے ان کے ان تجربات سے بھرے خطوط کسی سفرنامے سے کم نہیں ہوتے۔

آجکل کا دور انٹرنیٹ اور دیگر حیرت انگیز مواصلاتی رابطوں کا دور ہے جس میں آپ ٹیکنیکی سہولیات کے ذریعے چشمِ زدن میں اس کرہ ارض کے کسی بھی دوسرے خطے کی جانب سفر گھر بیٹھے بیٹھے کر لیتے ہیں۔ سفرناموں اور ٹریول گائیڈز کی تیاری اور چھپائی کا کام بیرونِ پاکستان بہت زیادہ ہے۔ بیرون ملک سفر کرتے ہوئے لوگ دوسروں کے تجربات پڑھ کر سفر کی معلومات تو جمع کرتے ہی ہیں مگر ساتھ ساتھ سفر ناموں کے مصنفین کے دلچسپ واقعات اور تجربات کو اپنا زادِ سفر بھی بناتے ہیں۔ اردو ادب میں سفرناموں کا سلسلہ طویل نہیں ہے۔ حج بیت اللہ اور مذہبی مقامات کی زیارتوں کے سفرنامے زیادہ تر لوگوں میں اس لئے بھی مقبول ہیں کہ ان کے ذریعے عازمین کو رہنمائی ملتی ہے۔ مگر مغربی ممالک کے سفرنامے رہنمائی سے زیادہ واقعات و تجربات اور مصنف کے فنِ تحریر کی کسوٹی پر پرکھے جاتے ہیں اور عوام میں مقبولیت کی راہ ہموار کرتے ہیں۔

عشرت معین سیما کا کتابی صورت میں یہ پہلا سفرنامہ ہے۔ میرے اپنے تجزیہ اور زاویہ نگاہ سے یہ ایک مکمل معلوماتی اور ذاتی تجربات سمیٹے ہوئے اردو ادب میں سفرنامے کی مختصر فہرست میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ بحیثیت قاری اور بحیثیت تبصرہ نگار میں نے اس سفرنامے کو نہایت دلچسپ عناصر سے بھرپور پایا۔ تصاویر اور معلوماتی مواد سے مزین یہ ایک مکمل تحریر ہے۔ اردو سفرنامے کی دنیا میں ان کی اس بہترین پیشکش پر ان کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے دعا گو ہوں کہ ''اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ''، خیر اندیش۔

ثروت عصمی۔ (استاد شعبہ اردو)

ابتدائیہ

میری زندگی میں بظاہر سفر کی ابتداء شاید زندگی کے پہلے سال ہی میں ہوئی۔ جب ابا اور امی میری پیدائش کے کچھ عرصہ بعد مجھے اور میرے بہن بھائیوں کو لیکر کراچی سے ڈھاکہ گئے جو اُس زمانے میں مشرقی پاکستان تھا اور جہاں میرا ننھیال تھا لیکن اُس سفر کے کوئی بھی نقوش میرے ذہن میں محفوظ نہیں ہیں۔

اس سفر کے بعد اندرونِ ملک بہت سفر کیے جن میں سے چند اتنے یادگار ہیں کہ آج بھی کچھ منظر کبھی آنکھوں میں آنسو اور کبھی ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دیتے ہیں۔ دوستوں کے ساتھ کراچی یونیورسٹی کا پاکستان ٹور، کالج کی چھٹیوں میں یاسمین باجی کے پاس اسلام آباد کے سفر، نوائے وقت کی جانب سے لاہور میں ٹریننگ کا سفر اور اس کے علاوہ بھی بیرونِ کراچی کے کئی سفر ہیں جو ناقابلِ فراموش ہیں اور ان تمام سفر کی یادداشت بھی میرے ذہن میں مکمل محفوظ ہے۔ مگر میری زندگی کے سب سے یادگار بیرونِ ملک سفر میں جرمنی کا سفر بہت اہم تھا۔ یہ سفر میری زندگی میں ایک نئی منزل کی جانب تھا۔ ایک ان دیکھی انجان منزل کی جانب ۔۔۔۔ مگر میرے رہبر سے میری شناسائی بہت پرانی تھی شاید اسی لئے یہ سفر مجھے زینہ بہ زینہ اور منزل بہ منزل زندگی کی اصل خوشیوں اور کامیابیوں سے روشناس کرواتا رہا۔

جرمنی آنے کے بعد یوں تو میں نے نہ صرف یورپ میں تقریباً تمام ممالک ہی

دیکھ لئے ہیں بلکہ امریکہ کی گلیوں میں بھی سرگردانی کر لی ہے مگر اس زیرِ نظر کتاب میں میں نے اپنے ایک اٹلی کے ایک یادگار سفر کی یاد داشتوں کو محفوظ کیا ہے۔ اپنی اس یادداشت میں میں نے اپنے زاویہ نگاہ سے متعین کردہ مناظر کو ہی قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ کو شاید کہیں میرا سفر تھکن سے بیزار نظر آئے۔ کہیں ہنستا کھیلتا، کہیں دکھ اور درد میں ڈوبا اور کہیں حیران کرتا دیکھائی دے۔ آپ کو اس سفرنامے کی ورق گردانی کرتے ہوئے میری نگاہ بھی موازنہ کرتی دیکھائی دیگی۔ شاید ہر مسافر کی طرح میں بھی کہیں کہیں تجسس اور تلاش کی لاٹھی پکڑے تاریخ کے راستوں کو کریدتی نظر آؤنگی یا کسی بہترین قانون اور اس کے عمل سے اپنا مستقبل سنوارتی دیکھائی دونگی۔ ہاں سفر کے دوران جب میں کسی منظر میں اس ملک اور جرمنی کا موازنہ پاکستان کے ساتھ کر رہی ہوتی ہوں تو کیفیت کچھ جذباتی اور کچھ افسوسناک بھی ہوجاتی ہے۔ یہ میرا پہلا سفرنامہ ہے اور اس سفرنامے میں اگر کچھ غلطیاں ہونگی تو معاف فرمایئے گا۔ میرا اندازِ نظر اور زاویہ نگاہ یقیناً آپ سے مختلف ہوسکتا ہے مگر میں نے پوری کوشش کی ہے کہ متعلقہ ملک اور اس کے سفر کے متعلق کچھ معلومات بھی آپ تک پہنچ جائیں اور اردو ادب میں سفرنامے کی زمین پر میرے سفر کے کچھ رنگ اپنے نقوش چھوڑ جائیں۔

دعاؤں کی طالب
عشرت معین سیما

اٹلی سے دعوت

مجھے جرمنی آئے اٹھارہ سال ہو چکے تھے۔ اٹھارہ سال ایک طویل عرصہ ہوتا ہے۔ ایک بچہ اپنی زندگی کے ابتدائی اٹھارہ سالوں میں یہاں ایک عاقل، بالغ اور جوابدہ انسان کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی تربیت پا کر خودمختار ہونے کا سرٹیفکٹ حاصل کر لیتا ہے۔

مجھے بھی یہاں یورپ کی زندگی میں رہتے بستے اپنی ذمہ داریوں کا اپنی پختہ اور خودمختار زندگی کی سند حاصل کرنا تھی۔ جو کچھ پاکستان میں دیکھا تھا، سیکھا تھا اور عمل کیا تھا وہ سب کچھ جرمنی آ کر صرف ایک زیرو کی حیثیت میں نظر آتا تھا۔ کیونکہ زبان اور ابلاغ انسانی زندگی کا سب سے ابتدائی مگر بنیادی مرحلہ ہوتا ہے۔ اُس زمانے میں لوگوں کو جرمنی آ کر جرمن زبان سے نافہمی کسی ایسے بچے کی طرح بنا دیتی تھی جو صرف اشاروں اور آوازوں کے ذریعے اپنا ابلاغ کرتا ہے۔ مگر آجکل ایسا ہرگز نہیں ہے۔ آج سے اٹھارہ بیس سال قبل جب میں یہاں آئی تھی تو سڑکوں بازاروں یا عام لوگوں میں انگریزی میں بات چیت کرنے کا اتنا رواج نہیں تھا۔ جرمن زبان سے تقریباً نابلد افراد جب اپنی ٹوٹی پھوٹی جرمن میں انگریزی اور اشاروں کنایوں کی زبان کا مرقع بنا کر اپنا مدعا بیان کرتے تو مسئلہ کسی حد تک تو قابل فہم ہو جاتا مگر پھر بھی سو فیصد،

ابلاغ مکمل نہیں ہو پاتا تھا۔اپنی زندگی کے دو ڈھائی عشرے گزارنے کے بعد پاکستان میں کراچی یونیورسٹی سے ابلاغِ عامہ کی ماسٹر کی سند لیکر کچھ عرصے اخبار اور ریڈیو کے ساتھ ساتھ ٹی وی کی بھی پریکٹیکل ٹریننگ حاصل کی۔آگے بھی مذید الیکٹرونک میڈیا میں ٹریننگ کا ارادہ تھا مگر ہمارے معاشرے میں ہر لڑکی کی اصل پریکٹیکل ٹریننگ پیاء گھر سدھارنے کی دی جاتی ہے۔نکاح نامے کا سرٹیفیکٹ دے کر ہمیں بھی جرمنی روانہ کر دیا گیا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ہمارا جرمنی کا ویزا فیملی ویزا نہیں تھا بلکہ اسٹوڈنٹ ویزا تھا۔اس زمانے میں دراصل جرمنی میں غیر ملکی طالب علموں کو اپنے ممالک یا خاندان سے کسی کو بھی بلانے کی اجازت نہیں تھی۔خاص طور پر قانونی طور پر رشتہ ازدواج سے منسلک لوگوں کو یہاں پر نہیں لایا جاسکتا تھا۔میری منگنی کو تین چار سال ہونے کو آرہے تھے۔شادی سے کچھ عرصہ پہلے گوئٹے انسٹیٹیوٹ جبراً داخلہ لے لیا تھا اور خود ہی اخذ کر لیا تھا کہ وہاں رہتے رہتے کبھی نہ کبھی تو زبان آ ہی جائیگی۔ زبان دانی کا ابتدائی سرٹیفیکٹ تو ہاتھ میں آ گیا تھا مگر زبان سے خاصی نا آشنائی تھی جس کا اندازہ ہمیں جرمنی آ کر ائیر پورٹ پر ہی ہو گیا تھا۔ جب ہماری شادی ہوئی تو اس وقت انور برلن فری یونیورسٹی میں میڈیکل کے اسٹوڈنٹ تھے۔میرا ویزا دوسرے شہر ڈوسلڈورف یونیورسٹی کا تھا۔امیگریشن کے عملے کے ساتھ گفت وشنید کیا ہوئی اور ہم اپنی سیکھی ہوئی جرمن زبان،انگریزی اشاروں کی زبان میں ان کو کہاں تک مطمعین کر پائے اس کا قصہ آپ یقیناً کسی نہ کسی تحریر میں ضرور پڑھیں گے۔مگر اس وقت بات ہو رہی ہے جرمن زبان کی، تو ہم نے یہاں جرمن زبان کو قابو کرنے کے لئے پابندی کے ساتھ ایک سال یونیورسٹی میں اور پھر چھ ماہ لینگویج اسکول میں نہایت یکسوئی کے ساتھ پڑھائی کی اور اس کے بعد یونیورسٹی لیول کا امتحان پاس کر کے باقائدہ جرمن زبان میں یونیورسٹی میں تعلیم کا آغاز کیا۔

اردو ایڈوانس،نفسیات اور اسلامک اسٹڈیز کے ساتھ گریجویشن میں اپنے کالج

میں پہلی پوزیشن لینے کے بعد ایم اے ماس کمیونیکیشن شاندار نمبروں کے ساتھ کیا تھا۔ اس کے علاوہ نوائے وقت، فیملی میگزین اور نیشن کراچی میں دو تین سال کا تجربہ ریڈیو اور ٹی وی کی ایکسٹرا ٹریننگ اور ایک ایڈورٹائیزنگ کمپنی میں گزارے چند ماہ کی مہارت کی سند ساتھ لئے جب جرمنی آئے تو لگ رہا تھا کہ اب بس تعلیمی مستقبل میں پی ایچ ڈی کی بریانی کو دم لگانا باقی ہے۔ بڑے غرور کے ساتھ جب یونی ورسٹی میں درخواست دائر کی تو معلوم ہوا کہ یہ سب سندیں ملکر یہاں کی ماسٹر ڈگری کے مساوی نہیں ہیں۔ پاکستان کا ماسٹر یہاں کا بیچلر بھی نہیں ہے۔ شکر ہے کہ بقیہ سندیں کام آئیں اور ماسٹر کے میجر سبجیکٹ کی نصف تعلیم تسلیم کر لی گئی۔ اب پہلے یہاں ماسٹر مکمل کرنا تھا۔ یعنی صحافت کے چار سمسٹر کے علاوہ دوسرا میجر سبجیکٹ منتخب کرنا تھا یا دو مذید سبجیکٹ اور لیکر پورے آٹھ سمسٹر کی پڑھائی تھی اور اُس کے بعد پی ایچ ڈی جو کہ ریگولر تین سے پانچ سال کے عرصے پر طے شدہ پروگرام کے تحت تھا۔ یہ سب جاننے کے بعد سوچا کہ شادی کے ہی سرٹیفکٹ پر کام کیا جائے کیونکہ بقول مختار عالم لڑکیوں کو تو ویسے بھی اپنی ڈگریوں سے میاں جی کو پنکھا جھلنا ہوتا ہے یا بچوں کی ناکیں پوچھنا ہوتی ہیں مگر یہاں میرے میاں جی ہی نے ضد پکڑ لی کہ پہلے جرمن زبان، پھر تعلیم اور پھر خاندانی منصوبہ بندی۔ کسی ایک کی تو ماننی ہی تھی لہٰذا ہم نے انجام پر نظر رکھے بغیر میاں کے کہے پر ہی ابتدا کر دی۔ گویا منزل کا تعین کئے بغیر ہی سفر شروع کر دیا ۔گذشتہ اٹھارہ بیس سالوں میں جو کامیابیاں حاصل ہوئیں اُن میں جرمن زبان پر عبور، میرا دوسرا ماسٹر، پی ایچ ڈی تک رسائی، ہندی تحریر و زبان پر گرفت، اردو زبان کے ساتھ اورینٹ کلچر کی نمائندگی، اردو ہندی زبان میں برلن کی پہلی خاتون صحافی، استاد اور اسی طرح جرمن صحافتی اداروں میں پہلی پاکستانی سند یافتہ صحافی خاتون مگر سب سے اہم دو پیاری بیٹیوں کی ماں ہونے کا درجہ بھی رب کریم کی مہربانی سے عطا ہوا۔

انڈیالوجی کی تعلیم کے دوران ہی مجھے فری یونی ورسٹی برلن میں بطور معاون استاد

اردو پڑھانے کا موقع ملا تھا اور ساتھ ہی ایک ادارے میں بھی پاکستان سے آنے والے تحقیق کاروں اور طالب علموں کی رہنمائی کی ذمہ داری بھی سونپ دی گئی تھی۔ پردیس میں اپنی زبان کے ساتھ یہ مظبوط رشتہ مزید مظبوط ہو رہا تھا۔ ۲۰۰۲ء میں میرا ماسٹر مکمل ہوتے ہی میری دوسری بیٹی نے دنیا میں آنکھ کھولی۔ اسکی پیدائش کے بعد سے میں نے جز وقتی طور پر پاکستانی اور ہندوستانی میڈیا کے لئے فری لانس جرنلسٹ کے طور پر اردو اور ہندی میں کام کرنا شروع کیا اس سے قبل میں جرمن اخبار اور ریڈیو میں کام کا آغاز کر چکی تھی۔ جرمن زبان دنیا کی مشکل مگر لوجیکل زبانوں میں شمار ہوتی ہے بحثیت غیر ملکی اس زبان میں صحافتی کارکردگی دکھانا آسان کام نہیں تھا۔ اکثر محسوس ہوتا کہ اتنا زیادہ جرمن زبان کے ساتھ مسلسل ابلاغ میری اپنی شناختی زبان ''اردو'' پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ اسی دوران برلن میں اردو ادب کا پہلا جریدہ '' نئی کاوش'' کے عنوان سے شروع کیا۔ بعد میں پاکستانی بچوں کو اپنی زبان سے آشنا کروانے کی کوشش میں باقائدہ اردو کی تعلیم کا نجی طور پر آغاز کیا اور اردو، وہندی زبان کو فروغ دینے کے لئے اسے برلن میں قائم شدہ تحقیقی اداروں اور جرمن حلقوں میں روشناس کرواتے ہوئے ادبی اور لسانی تحقیقی مقالے اور زبان کی تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا۔

یہ تمام سلسلے چل رہے تھے مگر زبان اور ابلاغ سے جڑا رشتہ مجھے اُس وقت ہی تسکین پاتا ہوا محسوس ہوا جب اٹلی کے ایک ریسرچ انسٹیٹیوٹ سے جرمن زبان کے اردو، وہندی زبان کے تعلق کے حوالے سے تحقیق اور ترجمہ کا ایک پروجیکٹ ہاتھ لگا جس میں میرا ادھورا پی ایچ ڈی مکمل ہونے کے بھی چانس موجود تھے۔ چونکہ ہندی، عربی فارسی زبانوں کے حوالے سے میں کئی ایک تحقیقی رپورٹ مختلف لسانی اداروں کے لئے تیار کر چکی تھی۔ لہٰذا اس پروجیکٹ میں میری خدمات کی پیشکش کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور ساتھ ہی اٹلی میں منعقد کردہ کانفرنس اور سیمینار میں شرکت کی

دعوت بھیجی گئی۔اس دعوت نامے کی موصولی میرے لئے کسی اعزاز سے کم نہ تھی۔

جہاں خوشی تھی وہاں یہ فکر بھی تھی کہ میں اپنے میاں اور بچوں کے بغیر اور وہ میرے بنا کیسے رہیں گے؟ میں ایک طرف خوش تھی کہ میرا بھولا بسرا ڈاکٹریٹ جو میرے پروفیسر نسپٹال کے اچانک انتقال کی وجہ سے ادھورا رہ گیا تھا، وہ مکمل ہو جائے گا اور اسی دوران مجھے ساٹھ گھنٹے یعنی ایک سمسٹر اردو پڑھانے کے لئے ایک کورس کی بھی پیشکش کر دی گئی تھی۔ یہ اگست ۲۰۰۹ء کی بات ہے۔ مجھے اکتوبر میں کام شروع کرنا تھا۔ ستمبر کے آخری ہفتوں میں جرمنی میں الیکشن تھے۔ صحافیانہ سرگرمیاں بھی اپنے عروج پر تھیں کہ ایک رات اچانک میرے پیٹ میں بہت درد اُٹھا، ایمرجنسی ہسپتال میں چیک اپ کروانے پر پتا چلا کہ پتے میں پتھر ہیں اور اس وقت فوری آپریشن کرنا ہوگا کیونکہ جان کا خطرہ لاحق ہے اور اس کے بعد مکمل آرام اور تقریباً تین مہینے کی تمام کاموں سے چھٹی کیونکہ ایک سال قبل ہی اچانک میرا اپنڈکس کا آپریشن ہوا تھا اور گردے میں بھی تکلیف تھی۔۔۔۔ڈاکٹر کی رائے سن کر سب سے پہلے اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریاں جو الیکشن سے قبل میرے سر تھیں وہ یاد آئیں پھر اس ریسرچ پروجیکٹ کے بارے میں سوچا، انور کی جانب دیکھا تو گھر کی اور بچوں کی دیکھ بھال کی فکر ستانے لگی۔ انور نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے تسلی دی۔ اب سب کچھ اللہ پر چھوڑ کر تین چار ماہ تک گھر بیٹھ گئی اٹلی بھی لکھ بھیجا کہ بیماری کی وجہ سے میں ان کی یہ پیشکش منظور کرنے سے قاصر ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ دنیا کے کسی نہ کسی خطے سے کوئی نہ کوئی اس پروجیکٹ پر کام کرنے آ گیا ہوگا اور میرے ادھورے کام بس اب ادھورے ہی رہ جائیں گے۔

مگر مجھے ۲۰۱۰ء کے پہلے مہینے میں ہی خوشخبری ملی کہ اس پروجیکٹ کو اگلے سمسٹر کے لئے آگے بڑھا دیا گیا ہے فروری کے دوسرے ہفتے تک مجھے سوچنے کا وقت دیا گیا تھا۔ پندرہ اپریل سے سمسٹر کا آغاز تھا اور فروری کے آخری ہفتے میں مجھے حتمی

''ڈوموڈی میلانو''

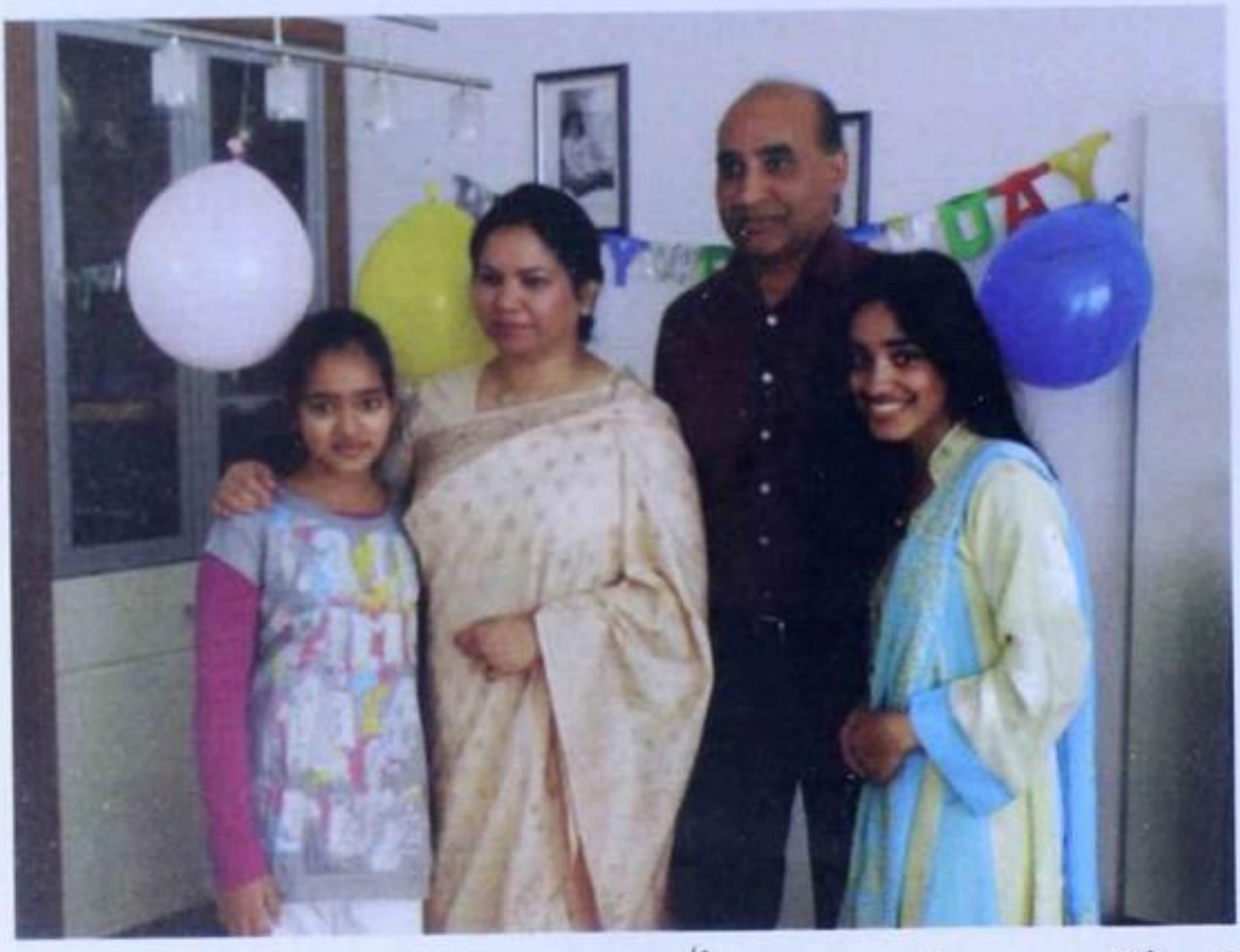

عشرت معین سیما اپنے شریک حیات انور ظہیر رہبر اور اپنی صاحبزادیوں سارہ اور مایا کے ساتھ

جرمنی کے گھر کے پائیں باغ میں کپڑے
سکھائے جا رہے ہیں

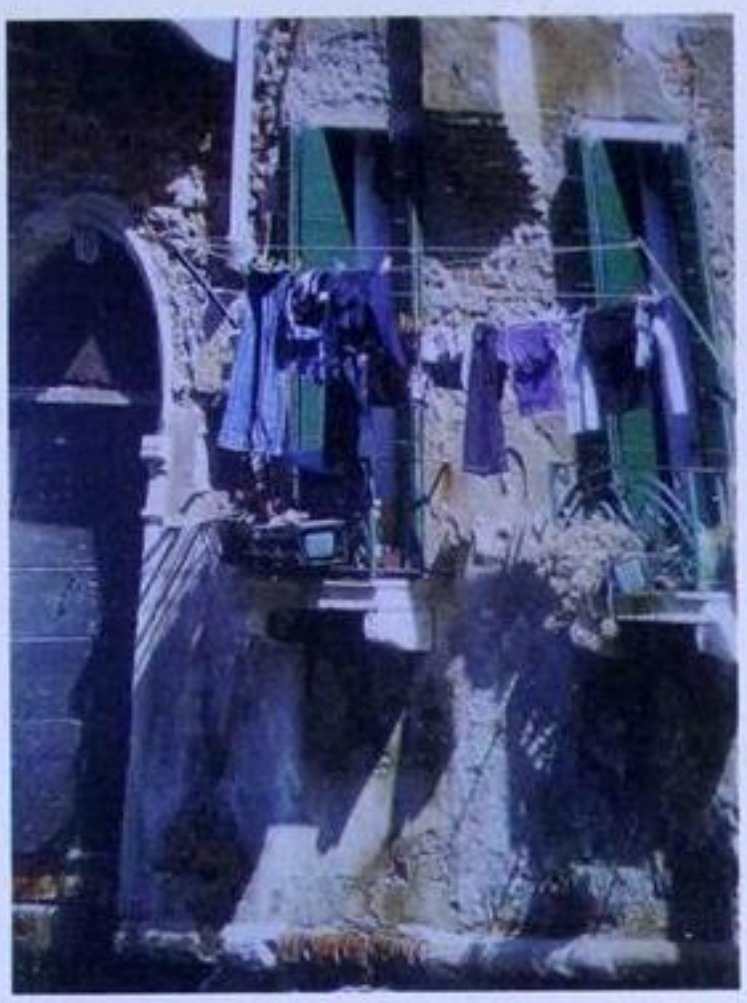

وینس کے ایک مکان کی بیرونی جانب
رسی پہ کپڑے سکھائے جا رہے ہیں

وینس میں ہوٹلوں کے باہر کھڑی گونڈولا کشتیاں

وینس میں جا بہ جا اس طرح کے پل راستوں کو جوڑ رہے ہیں

وینس کا چرچ

وینس

کنار یگو وینس کا مشہور چرچ

کاستیلو کا بیرونی منظر۔ ''جزیرہ مورانو'' جو شیشے کی صنعت گری کے لئے مشہور ہے۔

وینس کی خوبصورت واٹر روڈ

میلان کے چرچ کا اندرونی منظر

وینس کے مرکزی پل اور روایتی کشتیاں

میلان کا معروف چرچ ڈوموڈی میلانو

سین مارکو چرچ وینس کا ایک خوبصورت بیرونی منظر

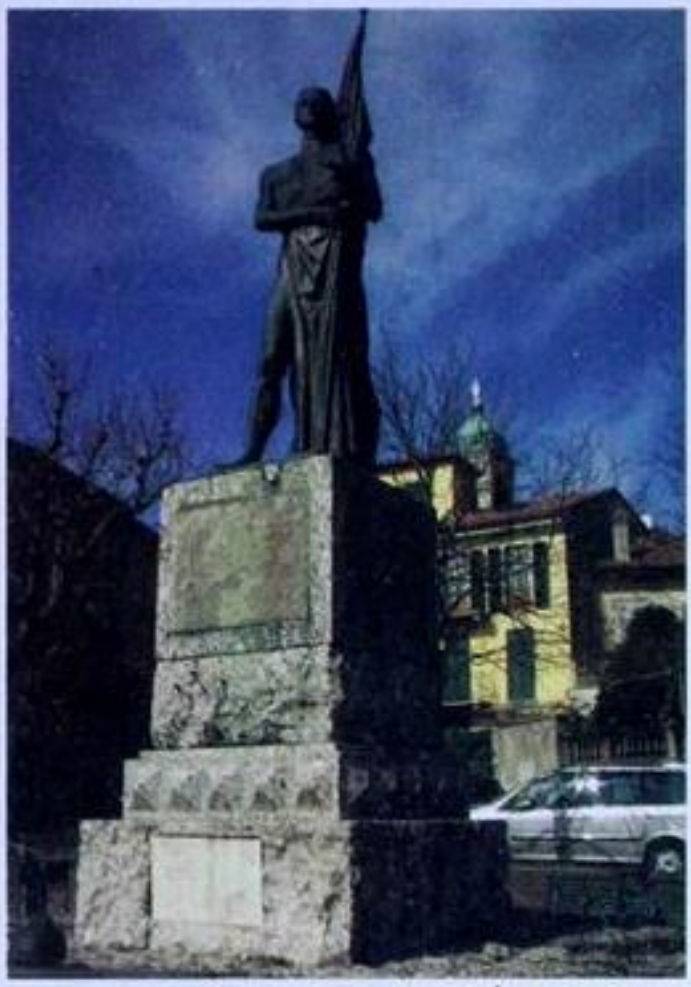

وریسے کے تاریخی اسٹیڈیم کے باہر ایک کھلاڑی کا مجسمہ

لینی کے ساتھ میلان کے معروف شاپنگ مال پیاسا ڈے ڈومو میں

پیاسا ڈے ڈومو

میلان کا مشہور شاپنگ سینٹر

وینس کے رہائیشی علاقے

میلان کا سینٹرل ریلوے اسٹیشن

میلان ٹورسٹ انفارمیشن سینٹر کی عمارت

جواب دینا تھا۔ بہت سوچ سمجھ کر ڈاکٹر کے ساتھ اور انور اور بچوں کے ساتھ بات چیت کر کے اس پروجیکٹ پر کام کرنے کی حامی بھر لی اور میں نے اپنے کام کا ابتدائی خاکہ تیار کر کے انسٹیٹیوٹ میں جمع کروا دیا۔ مارچ میں جب میرا شیڈول ورک قبول ہونے کی خوشخبری ملی تو ساتھ ہی ساتھ ایک افسوس ناک خبر بھی آئی کہ انور کے زین بھائی جان جو گذشتہ پچیس سالوں سے عمان میں مقیم ہیں سخت علیل ہیں اور علاج کے سلسلے میں برلن آنا چاہتے ہیں۔ میں نے ایک بار پھر اپنے خواب، منصوبے اور مستقبل کے لائحہ عمل کو کسی اور جانب مرکوز کر دیا اور تمام ادھورے پروجیکٹ سمیٹ کر رکھ ڈالے۔

اس بار مجھے افسوس نہیں تھا بلکہ خوشی تھی کہ میں یہ سب ایک ایسے شخص کے لئے کر رہی ہوں جو ایک باپ کی طرح شفیق اور دوستوں کی طرح رفیق ہے جس نے نہ صرف انور کے لئے بڑے بھائی کی ذمہ داری نبھائی ہے بلکہ باپ کی طرح پرورش میں بھی حصہ لیا ہے۔ ایک انسانی جان وہ بھی جس سے کوئی رشتہ جڑا ہو، اُس کی زندگی بچانے سے بڑھکر میرے نزدیک کوئی دوسرا عمل اُس وقت قابل غور و عمل نہیں تھا۔ اپریل کے بعد مجھے ایک بار پھر اگست تک کا وقت ملا کہ ستمبر سے یہ پروجیکٹ جوائن کر لوں۔ میں بھائجان کی بیماری دیکھتی تو دہل جاتی ایسے میں اپنا مستقبل بھی دھندلا دکھائی دیتا۔ میں خاموش ہی رہی ابکی بار انسٹیٹیوٹ کے ساتھ کوئی فون یا خط کے ذریعے رابطہ کرنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ اپریل ۲۰۱۰ء گذر گیا۔ عجیب بے چین دن رات تھے۔ بھائی سبحان کی حالت قدرے خراب تھی۔ زندگی اور موت کی جنگ جاری تھی۔ کبھی کبھی خوف آتا تھا کہ اگر وہ یہ جنگ ہار گئے تو کیا ہوگا؟ دُعائیں اور خدمت جتنی ممکن تھی سب کر ڈالیں۔ میرے رب نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ آپریشن کے بعد بھائی جان ٹھیک ہو گئے۔ اگست کے آخر میں انھوں نے واپس مسقط کی جانب لوٹنے کا ارادہ کیا۔

جولائی کے آخری دنوں میں آخری دعوت نامے کے عنوان سے مجھے ایک بار پھر

ایک خط موصول ہوا جس میں مجھے حتمی تاریخ کا تعین کرنا تھا۔

انور نے مجھے حوصلہ دیا اور فروری ۲۰۱۱ء میں کچھ نئے آئیڈیاز کے ساتھ اس دعوت نامے کو قبول کرتے ہوئے میں نے ایک بار پھر میلان یونیورسٹی کے سفر کی تیاریاں شروع کر دی۔ سفر اور رہائیش کی ذمہ داری ایک سماجی ادارے کی سربراہ نے قبول کی تھی جو کہ خود بھی اردو پڑھنے کے لئے اپنی دلچسپی ظاہر کر چکی تھیں اور ساتھ میں ایک معقول معاوضہ بھی ادا کرنے کو تیار تھیں۔ ظاہری بات ہے یہ بہترین پیشکش کیسے رد کی جاسکتی تھی۔

یونیورسٹی اور شہر میلان سے متعلق معلومات اکھٹا کرنا شروع کر دیں۔ بچوں کو دن رات یہ کہہ کہہ کر تسلی دیتی رہی کہ جلد آجاؤنگی تم ایک دوسرے کا خیال رکھنا اور پاپا کی بات ماننا۔ سارہ تو مطمئن تھی مگر مایا کو فکر تھی کہ صبح صبح اُس کے لمبے بالوں کی چٹیا کون بنائیگا؟ پاپا تو یہ کام بالکل نہیں کر سکتے اور سارہ کو خود اسکول کی جلدی ہوتی ہے۔ انور کو یہ فکر تھی کہ میں دیارِ غیر میں زبانِ غیر کے ساتھ کیسے گزارا کرونگی۔ لیپ ٹاپ میں کوئی ٹیکنیکل مسئلہ ہوگیا تو کیسے حل کرونگی۔

مگر ان ساری فکر مندیوں کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے میں نے فروری کے درمیانی ہفتے میں ائیر پورٹ پر انور اور بچوں کو خدا حافظ کہا اور میلان کے لئے روانہ ہو گئی۔ جہاز میں بیٹھتے ہی میری میزبان خاتون کا ایس ایم ایس آیا کہ سب کچھ خیریت سے ہوگیا ہے نا؟۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے دعائیہ الفاظوں میں اٹلی میں خیر مقدم بھی لکھ بھیجا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ خاتون کون ہیں؟ بس فون پر ہی ایک دو بار گفتگو ہوئی تھی اور ان کے ادارے کے متعلق میں نے کچھ معلومات بھی انٹرنیٹ سے لے لی تھیں۔ دل کچھ گھبرایا سا تھا مگر ایک خوشی بھی تھی کہ شاید زندگی کو کچھ بہتر کر دکھانے کا موقع ہاتھ آجائے۔ ان ہی سوچوں اور پلاننگ کو ذہن میں سمائے اب میں اپنی انجان میزبان کی جانب فضاؤں میں سفر کر رہی تھی۔

پہلا تاثر

میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ میں کسی محل میں رہونگی۔ زندگی میں یہ میری کبھی خواہش بھی نہیں تھی اور نہ ہی میں نے محل میں رہنے والوں کے بارے میں کبھی سوچا تھا۔ جب کبھی کسی اخبار یا رسالے میں کسی سیاست دان، کسی صنعت کار یا کسی زمیندار و جاگیردار کے بارے میں پڑھتی تو بہت کوفت ہی ہوتی تھی۔ میلوں تک پھیلی زمینیں، گھوڑے اور دوسرے جانوروں کے اصطبل، بڑی بڑی پجیرو جیپ اور گاڑیاں، بے راہ رو بچے اور قانونی اور غیر قانونی بیویاں اور ان کے متعلق عجیب عجیب باتیں۔ مجھے تو ان تمام باتوں سے کوفت ہی ہوتی تھی۔ شاید اسی لئے مجھے کبھی بھی امیر بننے یا امیر لوگوں سے رابطہ رکھنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بلکہ اکثر امیروں کے کارنامے پڑھ کر تو کراہیت ہی محسوس ہوتی تھی۔ میری زندگی میرے ہاتھ میں تھی۔ اُس پاک رب کی ذات کے سوا کسی کے سہارے کے بغیر میں نے اور انور نے بہت محنت کے ساتھ اپنی زندگی کو ایک مقام دلایا تھا۔ میرا خزانہ میرے گھر والوں کا پیار اور دوستوں کی سچی محبت سے بھرا پڑا تھا اور اللہ کا شکر ہے کہ اب تک بھرا ہوا ہے۔ میں اپنی چھوٹی موٹی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کام کرتی ہوں، اپنے فرائض کو

نبھانے کے لئے اپنے رشتوں کی پاسداری کرتی ہوں، اور اپنے آپ کو تسکین دینے کے لئے خود کو ادبی سرگرمیوں میں فعال رکھتی ہوں۔

اپنے دن بھر کے وقت کو میں نے اپنے گھر، خاندان، اپنی جاب اور اپنے لئے تقسیم کر کے رکھا ہوا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اس تقسیم شدہ وقت میں سب سے کم حصہ میرے اپنے لئے میسر ہوتا ہے۔ مگر جو وقت میرے بچوں کے لئے ہے، شوہر اور گھر کے لئے ہے وہ بھی میرا ہی وقت ہے۔ مگر انور کو ہمیشہ اعتراض ہوتا ہے کہ ''تم خود کو کبھی وقت نہیں دیتی ہو، اپنے آرام، اپنی زیبائش اور اپنی صحت کے لئے تمہارے پاس وقت نہیں ہوتا، زرہ سی گھر اور بچوں سے فرصت ملتی ہے تو آفس، خاندان، محلے اور اپنے ملک کی سیاست کے بکھیڑوں میں سوچ سوچ کر اور سماجی ہمدردی میں وقت برباد کرتی ہو'' ۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ وقت کی بربادی کا نہیں سیکھنے کا عمل ہے۔ سوچنے کی راہ ہے اور فکر کے پیچ وخم ہیں۔ ان سے گزر کر ہی میں کچھ لکھ پاتی ہوں۔ کیونکہ لکھنا اور پڑھنا ہی میری زندگی ہے۔ اگر یہ دو کام میری زندگی سے نکال دیے جائیں تو میں ادھوری ہو جاؤنگی۔ لکھنا اور پڑھنا ہی میری شناخت بھی ہے اور میری روح کی غذا بھی۔ میں پیشے کے لحاظ سے صحافی ہوں۔ عمل کے لحاظ سے طالبِ علم اور تجربے کے لحاظ سے اگلی نسل کے لئے استاد۔ لکھنا پڑھنا، پڑھانا، تحقیق و ترجمہ کرنا میری خارجی زندگی کے اولین عناصر ہیں۔ یہی میری طاقت بھی ہیں، پہچان بھی اور میرا ذریعہ معاش بھی۔ مگر میں نے کہا نا کہ میرا خاندان میری ذات کا سب سے اہم حصہ ہے۔ اس کے بغیر بھی میں ادھوری ہوں۔ میرا خاندان میری خارجی زندگی کا ستون ہے اور جب تک ظاہر اور باطن میں توازن نہ ہو تو زندگی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ داخلی اور خارجی زندگی کے عوامل ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں۔ کہیں توازن بگڑے دونوں پر اثر ہوتا ہے۔ اس توازن کو قائم رکھنے کے لئے اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے میں اپنی زندگی کو نت نئے رنگوں سے سجاتی رہتی ہوں۔

زندگی لین دین اور سمجھوتے کے اصول پر قائم ہے۔ یہ اصول ہمیں تجارت میں سب سے زیادہ نمایاں دکھائی دیتا ہے کیونکہ وہاں لین دین جنس اور زر کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو ہر جگہ یہ اصول کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ اس میں فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ ہماری نظر نفع اور نقصان پر زیادہ ہوتی ہے توازن پر کم۔ آج جو ہمارے معاشرے کا حال ہے، ہمارے گھروں کا حال ہے وہاں نفع اور نقصان کی رسہ کشی میں توازن بگڑ گیا ہے۔ جب تک ہم اپنی داخلی اور خارجی زندگی میں توازن قائم کرنے کی کوشش نہیں کرینگے تو گھر، معاشرہ اور ملک سب ہی زمین بوس ہو جائیں گے۔ میں اسی توازن کی جانچ پڑتال کے لئے بھی اپنے گھر سے دور نکل کر آئی ہوں کہ آیا میں جس چیز کو اپنی زندگی کا توازن سمجھ رہی ہوں وہ درست ہے یا نہیں۔ یہ تجربہ صرف میرے لئے نہیں بلکہ میرے گھر والوں کے لئے بھی نیا ہے۔ مجھے اپنی کمزوریاں، اپنی طاقت، اپنا اعتماد اور اپنا آپ بہتر اور واضح نظر آ رہا ہے۔ میں اپنا صحیح تجزیہ کر پا رہی ہوں۔ وقت کی تقسیم میں اس وقت میرا گھر اور اس کے مکین کم ہی حصہ دار ہیں۔ یہ سارا وقت میری دسترس میں ہے۔ مجھے سوچنے سمجھنے اور لکھنے کا موقع ملا ہے۔ اپنے آپ کو منوانے کا موقع ملا ہے۔ پہلے دن جب میرا لیکچر یونیورسٹی میں لوگ سن رہے تھے، سمجھ رہے تھے، مجھے دیکھ رہے تھے، مجھ سے سوال کر رہے تھے تو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اب تک جو کچھ علم میں نے اپنے اندر جمع کیا ہوا ہے یا جو کچھ معلومات میرے پاس ہیں یا مطالعہ کر کے ہو رہی تھیں، اب وہ صرف میرے اندر جمع نہیں ہو رہی ہیں بلکہ میں اس خزانے کو آگے دے رہی ہوں۔ یہ بھی توازن کا ایک حصہ ہے۔ میں یونی ورسٹی سے آ کر خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ بالکل ایسے ہی جیسے انور کے شام کو گھر آنے کے بعد سارے دن کا حال سنا کر ہوتی ہوں، جیسے اپنے بچوں سے پیار بانٹ کر ہوتی ہوں، جیسے پاکستان سے کسی خوشی کی خبر سن کر ہوتی ہوں یا جیسے نماز میں خدا کا شکر ادا کر کے ہوتی ہوں۔

یہ توازن ہماری زندگی میں کتنا اہم کردار ادا کرتا ہے مجھے اس کا بھرپور اندازہ ہو گیا تھا۔ کاش ہمارے سیاست دان، امراء اور شعبہء زندگی سے تعلق رکھنے والے تمام افراد یہ جان سکیں کہ صرف جمع کرنا چاہے وہ دولت ہو، وسائل ہوں معلومات ہو یا عزت وشہرت، زندگی کو بہت کمزور بنا دیتے ہیں۔ اس کا توازن بگاڑ دیتے ہیں۔ اس کرہء ارض کا توازن قائم رکھنے کے لئے، زندگی کو دوام بخشنے کے لئے، مسائل کے انبار کو دور کرنے کے لئے اور روح اور جسم میں توازن قائم رکھنے کے لئے اس عزت، دولت، شہرت، وسائل، وقت اور معلومات کو ہمیں بانٹنا ہوگا۔ اپنی اندرونی اور بیرونی دنیا کو خوشحال اور آباد رکھنے کے لئے جسم، ذہن اور روح میں توازن رکھنا بہت ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو بے کاری، وقت کا زیاں، صحت کی خرابی، رشتوں میں دراڑ اور معاشرے میں بگاڑ خود بہ خود وجود پاتے ہیں اور کسی جنگل کی گھاس کی طرح ہماری جڑوں میں خاموشی سے پھیل کر ہمارے وجود کو کھوکھلا کر دیتے ہیں۔

میں اپنے گھر سے بہت دور اس وقت اٹلی کے شہر میلان میں ہوں۔ اٹلی یورپ کے نقشے پر ۳۰۱،۳۳۶ کا حدود اربع رکھتا ہے۔ یہاں کی کل آبادی ۵۹،۱۳۱،۰۰۰ ہے۔ یہاں کا دارالخلافہ روم ہے جسکے بعد میلان یہاں کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ یہاں کی کل آبادی کا 67% فیصد حصہ بڑے شہروں میں آباد ہے جبکہ 33% فیصد آبادی دیہات میں رہتی ہے۔ یہاں مردوں کی اوسطً عمر 78 سال جبکہ عورتوں کی عمر 83 سال ہے جو کہ یورپ کے ساتھ ساتھ دنیا کی اوسط عمر کے بلند ترین درجے پر ہے۔

یورپ اور دنیا کے دیگر ممالک کے لوگ اٹلی کے فن وثقافت کے مداح ہیں۔ قدرت نے یہاں اپنی دلکشی ہر لحاظ سے برقرار رکھی ہوئی ہے۔ پہاڑ، دریا، جنگلات اور قدرتی حسن کے تمام نظارے جو سیاحوں کے لئے دلکشی کا باعث ہیں نہ صرف وہ اُنہیں یہاں کھینچ لاتے ہیں بلکہ زبان کے ذائقے، چاشنی اور صحت مند کھانوں کی پیشکش کے لئے بھی یہ ملک پورے یورپ بلکہ دنیا میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔

مختلف اطالوی ثقافتی مراکز یہاں مختلف قسم کے سیاحوں کے لئے تعلیم اور تجارت کے شعبے میں جدید تربیتی کورس کے ساتھ ساتھ زبان کی تعلیم میں بھی ہمہ تن مصروف ہیں۔ یہ تربیتی مراکز نجی اور سرکاری طور پر یورپ کی مختلف درسگاہوں کے ساتھ ملکر کام کر رہے ہیں۔

میں میلان کے قریبی شہر وریسے میں جس خاتون کے پاس رہائش پزیر ہوں ان کا خاندان اپنی پشت سے یورپ کا شاہی خاندان ہے۔ اِن کا شمار دنیا کے اولین پچاس امیر خاندانوں میں سے ہے۔ اٹلی کی معاشی استحکام کی ایک ڈور اس خاندان کے ہاتھ میں ہے۔ ان کے پاس دولت، عزت، شہرت، خاندان اور لوگوں کی محبت کی فراوانی ہے۔ میاں بیوی سات بچوں اور پانچ مستقل ملازموں پر مشتمل یہ گھرانہ ہر لحاظ سے اپنا توازن قائم رکھے ہوئے ہے۔ اس گھر کی خاتونِ خانہ اپنے خاندان کا کام اپنے ہاتھوں سے انجام دیتی ہیں۔ انھوں نے اپنے شوہر کے ساتھ ملکر تعلیم کو غریب اور غیر ترقی یافتہ ممالک میں فروغ دینے کا بیڑہ اُٹھایا ہوا ہے۔ افریقہ، ایشیاء اور مشرقی یورپ میں ''پہلے روٹی پھر کتاب'' کے عنوان سے یہ بھوک اور جہالت کے خلاف سر گرمِ عمل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دنیا اسی لئے بے توازن ہو رہی ہے کہ مغرب میں ہمارے پاس علم اور غذا دونوں کی کمی نہیں ہے مگر دنیا کے بیشتر خطے اس نعمت سے محروم ہیں۔ میں اس کتاب میں انکا ذکر تو کرونگی مگر ان کی درخواست پر ان کا نام اور ادارے کا نام خفیہ رکھا جائے گا۔

یونیورسٹی کی جانب سے اس خاندان اور میری میزبان خاتون کا تعارف غائبانہ کروادیا گیا تھا۔ میرے آنے سے ایک دن قبل میری ان سے فون پر تفصیلی بات چیت بھی ہوگئی تھی۔ مگر میرا تجسس ابھی باقی تھا۔ میں پہلی بار اپنے گھر والوں کے بغیر کسی اجنبی اٹالین خاندان کی مہمان تھی۔ جرمن کلچر سے تو واقف تھی مگر کبھی کسی جرمن کے ساتھ یا جرمن فیملی کے ساتھ اکیلے رہنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ہزاروں سوال ذہن

میں اُٹھ رہے تھے۔ میری میزبان خاتون نے مجھے بتایا تھا کہ اُن کا ایک خدمتگار مجھے ائیرپورٹ پر لینے آئیگا اور یونیورسٹی تک بھی پہلی بار وہی لیکر جائے گا۔ وہ خدمتگار انگریزی اور جرمن زبان بالکل نہیں جانتا ہے لیکن دوران سفر اگر کوئی مسئلہ ہوا تو موبائل کے ذریعے بات چیت ہوجائے گی، جس میں وہ ترجمان کی خدمات انجام دے دیں گی۔

ائیرپورٹ سے باہر نکلتے ہی میں نے ایک ادھیڑ عمر کے اٹالین شخص کو اپنے نام کا سائن بورڈ اٹھائے دیکھا تو اسکی جانب آکر اپنا تعارف کروایا۔ اُس شخص نے مسکرا کر ہاتھ ملایا اور میرا سامان لیکر آگے بڑھ گیا۔ باہر گاڑی میں سامان ڈال کر اُس نے فون پر میری میزبان خاتون سے میری بات کروائی۔ مجھے بھی اب ذرا تسلی ہوگئی تھی۔ گاڑی تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے چلی اس شخص نے درمیان میں ایک جگہ گاڑی روک کر اشارے سے مجھے ایک عمارت دکھائی۔ میری سمجھ میں کچھ آیا تو نہیں مگر خالصتاً سیاحوں والے انداز میں حیرت اور خوشی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی، مجھے اس ٹرپ میں اس شہر میں دو ڈھائی ہفتے رہنا تھا۔ اب اٹالین زبان کے بغیر میرا ابلاغ کیسے ہوگا میں اسی سوچ میں تھی کہ ہم ایک پہاڑی راستے سے اترتے ہی ایک قدیم عمارت کے آہنی صدر دروازے کے سامنے موجود آکھڑے ہوئے۔

کیمرے کی آنکھ نے حرکت کی اور آہنی دروازہ خود بہ خود کھلا تو گاڑی آہستہ آہستہ اندر داخل ہوگئی۔ اونچے اونچے درختوں اور قدیم محل نما عمارت کے احاطے میں دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس اطالوی مددگار نے میرا سامان احاطے کی پہلی عمارت کے سامنے رکھ دیا۔ میں نے گاڑی سے باہر آنے کی کوشش کی تو اشارے سے منع کر دیا اور سامان رکھ کر دوبارہ وہ گاڑی اسٹارٹ کرلی۔ گاڑی آگے بڑھی اور تقریباً دو تین منٹ کے بعد ایک قدیم ترین محل نما عمارت کے سامنے رک گئی جو کہ چاروں جانب سے باغات اور نہر کے علاوہ اونچے اونچے درختوں سے گھری ہوئی تھی۔ وہاں ایک

دبلی پتلی سی درمیانی عمر کی خاتون جو میری میزبان تھیں پُرخلوص مسکراہٹ لئے میرے استقبال کو کھڑی تھیں۔ گاڑی سے اُتر کر میں نے اُن سے مصافحہ کیا اور جواباً انہوں نے مجھے پرجوش خوش آمدید کہا۔

سادہ جینز کی پینٹ دھاری دار بھورے سوئٹر اور جوگر جوتوں میں دیکھ کر یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اس محل کی مالکن ہیں اور شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ یقیناً خاتونِ خانہ ملکہ الزبتھ کی طرح شاہی لباس، پروں والی ٹوپی اور زیورات سے مذین ہوں گی۔ پہلا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ وہ مجھے عمارت کے بالائی حصے میں لیکر چلی گئیں اور سامنے بیٹھک میں تشریف رکھنے کی درخواست کرتے ہوئے کہیں اندر چلی گئیں جہاں شاید وہ کچھ اپنے آفس ورک میں مصروف تھیں۔ مجھے مختار مسعود کی کتاب آواز دوست کے کچھ الفاظ یاد آ گئے۔ یہ محل کا یہ کمرہ بھی اپنے حدود و اربع سے یہ بات ظاہر کر رہا تھا کہ پرانے زمانے میں محلوں میں کسی فریادی کی فریاد بادشاہوں کی سماعت تک کیوں نہیں پہنچا کرتی تھی اور فریادی کی التجا سننے کے لئے کیوں زنجیریں لگوانے کی ضرورت پیش آیا کرتی تھی۔ اس اونچے کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ دیو قامت کتابوں کی شیلف لگی ہوئی تھی۔ جس میں دنیا بھر کے موضوعات پر مشہور مصنفین کی کتابیں قرینے سے سجی ہوئی تھیں۔ میں آہستہ آہستہ کتابوں کی الماری کے نذدیک آ گئی۔ ابھی کسی کتاب کو ہاتھ لگانے ہی والی تھی کہ خاتونِ خانہ معذرت کرتی ہوئیں کمرے میں داخل ہوئیں اور ساتھ ہی درخواست کی کہ میں منہ ہاتھ دھوکر کھانا کھالوں۔ پچاس لوگوں کی کھانے کی میز پر ہم صرف دو افراد بیٹھے تھے۔ عجیب سا لگ رہا تھا۔ محل کا یہ کمرہ یورپ کے قدیم اور روایتی نقش و نگار سے اور سامانِ آرائش سے سجا ہوا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں کسی میوزیم میں بیٹھی ہوں اور خود بھی تاریخ کا کوئی حصہ ہوں۔ خاتون میرے اندر کے حال شاید جان گئی تھیں اسی لئے انہوں نے میری طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا کہ ”جب میں اکیلی

ہوتی ہوں تو بارو چی خانے میں ہی کھانا کھالیتی ہوں اگر تم چاہو تو رات کا کھانا ہم وہیں کھائیں گے''۔ مجھے اس وقت ایسا لگا کہ اب شاید نوالہ میرے حلق سے آسانی سے اُتر سکے گا۔ میں نے مسکراتے ہوئے سر ہلا دیا۔

کھانے کے بعد میری میزبان میرے ساتھ اپنے طویل باغ اور نہروں سے گزر کر احاطے کی اُس عمارت کی جانب آ گئیں جہاں وہ مددگار ڈرائیور میرا سامان رکھ کر گیا تھا۔ میرا سامان ابھی تک باہر رکھا ہوا تھا۔ میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود خاتونِ خانہ نے میرا سوٹ کیس اُٹھا لیا اور عمارت کا صدر دروازہ چابی سے کھولتے ہوئے اندر داخل ہو گئیں۔ یہ ہمارا مہمان خانہ ہے اور فی الحال یہ تمہاری رہائش گاہ ہے، نچلی منزل پر دو کمرے ملازمین کے ہیں جو اس وقت چھٹیوں پر ہیں اور اس کے ساتھ ہی یہاں ایک بڑا باورچی خانہ، باتھ روم اور اسٹور روم ہے۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے انہوں نے اشارے سے نچلی منزل کا نقشہ بتاتے ہوئے کہا میں خاموشی سے جائزہ لیتی ہوئی انکے پیچھے چلدی۔ اوپر پہنچ کر انہوں نے میرا سوٹ کیس برآمدہ نما جگہ پر رکھتے ہوئے کہا کہ دائیں جانب ڈرائنگ روم اور ایک لائبریری ہے جبکہ بائیں طرف کی راہداری کے برابر میں تین کمرے ہیں۔ جن میں دو سونے کے ہیں اور ایک عبادت کا ہے۔ دونوں سونے کے کمروں میں ملحقہ باتھ روم ہیں اور صرف ایک کمرے کے ساتھ ٹیرس ہے جو سب سے آخر میں ہے اور یہ ٹیرس والا کمرہ تمہارا ہے۔ اوپر ورزش کرنے کے کمرے اور ایک سٹوڈیو ہے۔ تم یہاں دوسرے بیڈ روم کے علاوہ سبھی کمروں کو استعمال کر سکتی ہو۔ یہاں اور کون کون رہتا ہے یا رہے گا؟ میں نے آہستہ سے پوچھا۔ یہاں صرف مہمان رہتے ہیں یا نچلے حصے میں ملازم ہوتے ہیں جو کہ آجکل چھٹی پر ہیں، تم آرام سے یہاں رہو بس شام کو چھ سات بجے میری طرف آ جانا۔ رات کے کھانے کے بعد میں تم سے تفصیل سے بات چیت کرونگی۔ انہوں نے مجھے تسلی دیتے ہوئے جواب دیا اور واپس نیچے کی طرف

سیڑھیاں اُترنے لگیں۔ پھر اچانک جیسے اُن کو کچھ یاد آیا اور میری طرف پلٹ کر بولیں ''اور ہاں! غیر ضروری بتیاں نہ جلانا اور پانی اور ہیٹر کا استعمال بھی غیر ضروری نہیں کرنا۔۔۔توانائی کی بچت ملک کی ترقی کا ضامن ہوتی ہے۔ میں حیران ہو کر ان کی شکل دیکھنے لگی۔ اتنا بڑا گھر اور اُس کے اخراجات اور ساتھ میں وہی سیاست دانوں والا توانائی کی بچت کا بھاشن۔ جی! جی میں پوری کوشش کرونگی میں نے تعظیماً جواب دیا۔ اب وہ اطمینان سے آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترتے ہوئے واپس لوٹ گئیں۔ میں نے دروازہ اندر سے لاک کرلیا۔

اتنے بڑے گھر میں میں اکیلی کیا کرونگی؟ سب سے پہلے ٹی وی کھولا تو تمام چینل اطالوی زبان میں تھے پھر انٹرنیٹ چلانے کی کوشش کی مگر میرا قدیم لیپ ٹاپ اٹلی کے جدید نیٹ ورک سے میل نہ کھا سکا۔ سب کچھ بند کر کے ٹیرس میں آ گئی۔ ہوا میں خنکی تھی۔ سورج آہستہ آہستہ اپنے سفر سے واپس لوٹ رہا تھا۔ سامنے والے باغ میں چند ہرن دوڑتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایک عورت بڑا سا پیکٹ اُٹھائے میری رہائشی عمارت کی جانب آتی دکھائی دی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اُسے واپس جاتے ہوئے دیکھا۔ اب وہاں کوئی آدم نہ آدم ذاد تھا۔ اندر آ کر کمرے میں ریڈیو آن کر دیا اور جرمن یا انگریزی زبان کے چینل تلاش کرنے لگی۔ کچھ دیر کی کوشش کے باوجود جب کامیابی حاصل نہ ہوئی تو اسے بند کر کے صوفے پر بیٹھ کر کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ اچانک یاد آیا کہ میں ٹی وی اور کمپیوٹر بیٹھک میں کھلا چھوڑ آئی ہوں اور ساتھ میں بتی بھی بجھانا بھول گئی ہوں۔ فوراً توانائی کی بچت کے خیال سے زیادہ خاتونِ خانہ کی ناراضگی کا خیال آیا۔ میں جلدی سے بتی بجھا کر اور ٹی وی و کمپیوٹر بند کر کے اپنے کمرے میں آ گئی۔ وقت کاٹنے کے تمام سہارے یعنی انٹرنیٹ، ٹی وی ریڈیو اور فون کچھ بھی نہیں تھا۔ ہاں میرا موبائل فون تھا مگر اٹلی کی سرحد میں داخل ہوتے ہی کالنگ اور رومنگ اِن کے ریٹ سن کر طبیعت خود بہ خود بچت کی طرف مائل ہو گئی تھی۔

میں نے اب بہت تفصیل سے اپنے کمرے کا جائزہ لیا اور سوٹ کیس سے اپنا سامان نکال کر الماری اور باتھ روم میں رکھنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد نہا دھو کر میں باہر ٹارچ لیکر بھول بھلیوں والے رستے پر اپنی میزبان کی رہائشی عمارت کی جانب چل دی۔ عمارت کے باہر ہی دو کتے اور چند بلّیاں ادھر اُدھر منڈلا رہے تھے۔ بچپن ہی سے مجھے کتوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ میں نے دونوں ہاتھ اور کوٹ کی جیب میں ڈال لئے اور دعائیں پڑھتی ہوئی منزلِ مقصود کی جانب بڑھنے لگی۔ سردیوں کی شام تھی سات ہی بجے ہونگے مگر خاموشی اور پُراسرار عمارت اور ہلکی ہلکی جانوروں کی آوازیں عجیب سراسیمگی کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ باغ میں کہیں کہیں سولر انرجی کے گارڈن لیمپ لگے ہوئے تھے۔ جب میں دوسری عمارت کو جانے والے اندھیرے رستے میں چاروں طرف اونچے اونچے درختوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی دوسری عمارت کی جانب آئی تو میزبان خاتون کو محل کے پچھلے حصے کے دروازے پر کھڑا پایا۔ مجھے قریب آتا دیکھ کر وہ وہیں سے بولیں کہ ''اگر تمہیں کتوں سے ڈر لگتا ہے تو میں اُن کو کل ہی کسی دوسری جانب منتقل کروادونگی''۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ میرے منہ سے برجستہ جواب نکل گیا۔ وہ مسکراتے ہوئے عمارت کے عقبی راستے سے مجھے لیکر اندر آگئیں۔ اندر سے بھی اتنی بھول بھلیاں تھیں کہ کبھی ایک دروازہ کھلتا تو کبھی راہداری اور کبھی کوئی کمرہ رستے میں آجاتا۔ پھر اچانک کسی راہداری سے ہوتے ہوئے ہم باورچی خانے تک پہنچ گئے۔

اُن کا باورچی خانہ بھی سو مربع میٹر سے کم نہ ہوگا۔ ایک طرف بڑے بڑے چولہے دوسری جانب دیو قامت الماریاں جن میں برتن سجے ہوئے تھے۔ دوسری طرف کنگ سائز فرج اور ضرورت کی چیزوں سے مذین الماریاں داہنی جانب کچھ پرانے اسٹائل کی کرسیاں اور ایک بڑی میز تھی جس پر انواع و اقسام کے پھل سجے ہوئے تھے۔ کچن کے ایک طرف ایک درمیانی میز تھی جس کے اوپر ایک چھوٹی اسکرین

نصب تھی جس میں بیک وقت عمارت میں نصب شدہ بیس کیمروں کی تصاویر براہِ راست وہاں آ رہی تھی۔ میز پر فون، کاغذ قلم، لیپ ٹاپ اور دیگر چیزیں ایک عارضی دفتر کا نقشہ پیش کر رہی تھیں۔ خاتونِ خانہ کھانا میز پر چُن رہی تھیں۔ کتنے لوگ یہاں رہتے ہیں؟۔ میں نے بغور کچن کا جائزہ لیتے ہوئے بے اختیار پوچھا۔ میرے شوہر اور میرے سات بچے ہیں اس کے علاوہ تقریباً اس محل کی دیکھ بھال کے لئے پانچ مستقل مددگار ہیں۔ نہایت ملائم لہجے میں خاتون نے جواب دیا۔ خاتون کو دیکھ کر کہیں سے بھی نہیں لگتا تھا کہ یہ سات بچوں کو جنم دے چکی ہیں۔ یورپ میں وہ بھی اس دور میں جہاں اگر کوئی تین بچوں کے ساتھ راستے میں نظر آئے تو اردگرد کے افراد کی نگاہیں خود بہ خود متفکرانہ ہو جاتی ہیں۔ کبھی ہمدردی سے اور کبھی حیرت سے اور اگر یہ بچے کسی غیر جرمن کے ہوں تو یہی نگاہیں کبھی کبھی غصیلی بھی ہو جاتی ہیں۔ میں نے اپنی سوچ اور زبان کو قابو کرتے ہوئے خاموشی اختیار کر لی اور چپ چاپ کھانا کھانے میں مشغول ہو گئی۔

کھانے کے دوران خاتونِ خانہ نے مجھ سے پوچھا کہ میں کھانے میں کیا پسند کرتی ہوں۔ ابھی میں اُن کو جواب دینے ہی والی تھی کہ انہوں نے اپنے اطالوی لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے بلا وقفہ بولنا شروع کر دیا کہ ''دراصل ہمارے گھر کا قانون ہے کہ کھانے کا ایک زرہ بھی ضائع نہ کیا جائے۔ اگر گوشت پسند نہ آئے یا بچ جائے تو بلی اور کتوں کے کھانے کے ڈبے میں ڈال دیا جائے اسی طرح سبزی سلاد اور پھل وغیرہ مرغیوں بکریوں اور ہرن وغیرہ کے کھانے کے ڈبے میں ڈال دینا اور نوڈل اور روٹی یا چاولوں کو پرندوں کے کھانے کے ڈبے میں ڈال دیا جائے تو بہتر ہے۔ پھر اس کے بعد انہوں نے ری سائیکلنگ کا نشان بنے اور جلی حروف سے نشاندہی کرتے ہوئے رنگ برنگے کوڑے دانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے یہاں کوڑا الگ الگ جگہ جمع کیا جاتا ہے بے کار یا ردی کاغذوں کے لئے نیلا ڈبہ، پھل،

سبزی کے چھلکوں اور بیج گھٹلیوں کے لئے ہرا ڈبہ، پلاسٹک اور المونیم کی پیکنگ وغیر کے لئے پیلا ڈبہ۔۔۔میں نے اُن کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا کہ مجھے معلوم ہے ہم لوگ بھی جرمنی میں اسی طرح رنگ برنگے ڈبوں کو علامت بنا کر الگ الگ کوڑا جمع کرتے ہیں۔ جرمنی میں ری سائیکلنگ کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ میں اُن کی ہدایت کے جواب میں ماحولیات اور اسکے تحفظ پر جرمنوں کی ترقی کے گُن گانے لگی۔ انہوں نے مجھے بریک لگاتے ہوئے کہا ''ارے! تمہیں تو بہت اچھی طرح ماحولیات کے بارے میں پتہ ہے پھر تم اپنی اس معلومات کو اپنے لوگوں کے ساتھ کیوں نہیں بانٹتی ہو؟ ہم یہاں ماحول کو بچانے کے لئے دن رات کوشش کرتے ہیں۔ اپنی اپنی معلومات کے مطابق ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔ مگر ماحول تو پوری دنیا کی بقا کے لئے ہے نا؟ اپنے اس عمل اپنی اس معلومات کو اپنے ملک کے لوگوں کے ساتھ بانٹو تا کہ وہ بھی زمین کا توازن برقرار رکھنے میں معاون ہوں ورنہ زلزلہ اور سیلاب جیسی ناگہانی آفات کا سامنا ہوتا رہے گا''۔ میں نے اُن کی اس ناصحانہ ہدایتوں کے جواب میں فوراً کہا کہ ''ارے! وہ تو بچارے غریبوں کی قسمت ہے، بس اللہ کا سارا کرم بھی یورپ امریکہ اور امیر ملکوں ہی پر ہے۔ بچارے غریب اپنی غربت اور تنگدستی سمیت عذابِ الہیٰ بھی اُٹھا رہے ہیں''۔ میں نے سارا الزام قسمت پر دھر دیا۔ ''ارے نہیں نہیں ۔۔۔اپنی قسمت بنانے والے بھی تو ہم خود ہی ہیں۔ اپنی لاعلمی کی وجہ سے نہ صرف خود کو بلکہ ساری دنیا کو ہم خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ تم ایک قابل عورت ہو، پڑھی لکھی ہو تمہیں ایسا نہیں سوچنا چاہیے''۔ انہوں نے متفکرانہ انداز میں میری باتوں کو رد کرتے ہوئے کہا اور پھر گویا ہوئیں ''قدرت کا نظام ترازو کے دو پلڑوں کی طرح ہے۔ توازن برقرار رکھنے کے لئے اعتدال کا بہت خیال رکھنا پڑتا ہے۔ تمہارا معاشرہ تو مذہب اسلام کی بنیاد پر وجود میں آیا ہے اور مذہبِ اسلام تو اعتدال کا وہ نظامِ زندگی پیش کرتا ہے جو دنیا کا کوئی مذہب نہیں پیش کرتا۔ پھر تمہارے ملک میں ایسا کیوں

ہے؟ کیا کبھی سوچا ہے تم نے اس بارے میں؟ خاتون ایک ہی رو میں سب کچھ کہہ گئیں۔ کوئی غیر ملکی پاکستان کو یا اُس کے نظام پر نکتہ چینی کرے تو مجھے بہت بُرا لگتا ہے۔ کبھی کبھی تو بہت غصہ آتا ہے۔ لیکن بحیثیت صحافی میرا اکثر اس موضوع پر مختلف غیر ملکیوں اور اُن کے اداروں میں صفائی پیش کرنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ لیکن اس وقت میں تھکی ہوئی تھی۔ بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔ چپ چاپ کھانا کھا کر ٹارچ سنبھالے مختلف رستوں سے ہوتی ہوئی اپنی رہائش گاہ تک آ گئی۔

پہلے دن نیند بھی صحیح سے نہیں آئی۔ اتنے بڑے محل میں اکیلی خاتون بھی خاصی پراسرار لگ رہی تھیں پھر یہ بھوت بنگلہ بھی عجیب وحشتناک سا منظر پیش کر رہا تھا۔ اگلے روز میں ناشتہ کرنے جب اپنی میزبان کی طرف گئی تو انہوں نے حسبِ روایت مسکراتے ہوئے میرا استقبال کیا اور خوشخبری سنائی کہ میرے قیام کے دوران تمام کتوں کو احاطے کی دوسری طرف رکھ دیا گیا ہے۔ ناشتے کے بعد وہی خدمتگار ڈرائیور آ گیا اور میں اُس کے ساتھ اپنے کام پر چلی گئی۔

یونیورسٹی میں شعبہء تاریخ و تہذیب کی پروفیسر ڈاکٹر انجلا مسواتی نے میرا پُر تپاک خیر مقدم کیا اور جنوبی ایشیاء کی زبانوں پر کی گئی مختلف تحقیقات میرے سامنے پیش کیں۔ ساتھ ہی میری تحقیق جو کہ اردو ہندی زبان کا یورپی زبان کے ساتھ تعلق کے سراغ کو بہت سراہا۔

اس کے بعد اِس کے بعد اردو گرامر میں دیگر زبانوں کے اثرات پر بات چیت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چونکہ یہ سیمنار آج اوپن تھا تمام لوگوں کو شرکت کی دعوت تھی تو یہاں چند ایک اساتذہ بھی تھے، طالبِ علم بھی اور اردو جرمن اور ہندی سے تعلق رکھنے والے چند پرستار بھی۔ ایک بات جو مجھے سب سے زیادہ پریشان کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ لوگ یہاں انگریزی نہ ہونے کے برابر بولتے اور سمجھتے ہیں جبکہ جرمن سمجھنے والوں کی تعداد بھی بہت کم ہے۔ سوائے چند ضروری جملوں کے اطالوی مجھے نہیں آتی

تھی۔ہاں البتہ انگریزی کے ہر لفظ کے ساتھ اگر'' او'' لگا دیا جائے تو معاملہ قدرے فہم ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔

ایک روز کام کے بعد میں شاپنگ سینٹر تلاش کر رہی تھی۔میری بس نے اپنے طے شدہ پلان کے مطابق اسٹاپ پر اتار دیا تھا۔ پیدل چلنے والوں کے لئے نہایت تنگ رستہ تھا۔سامنے ہی ایک بڑی سی عمارت تھی۔باہر سے خاصی جگمگا رہی تھی۔میں اُسے شاپنگ پلازہ سمجھ کر اندر داخل ہوگئی۔اندر آنے پر معلوم ہوا کہ یہ اسپورٹس کلب ہے۔چونکہ یورپ کے لحاظ سے یہاں گرمی بہت زیادہ ہوتی ہے لہٰذا یہاں اسپورٹس کلب ایک بڑے ہال کے اندر بنائے جاتے ہیں۔جہاں نہ صرف جسمانی ورزشوں بلکہ کئی کھیلوں کے بڑے بڑے ہال ہوتے ہیں۔اس اسپورٹس کلب کے ساتھ ہی وریسے کا تاریخی اسٹیڈیم بھی موجود تھا۔۔۔۔لوگوں کا ہجوم اندر اور باہر آنا جانا کر رہا تھا۔ مجھے کراچی میں پارک ٹاور کا شاپنگ سینٹر یاد آ گیا۔اس کے باہر بھی ایسی ہی جگمگاہٹ ،لوگوں کا ہجوم اور گاڑیوں کی قطاریں رہتی ہیں۔ اس ہیلتھ سینٹر کی یہ بازاروں والی رونق پہلی بار دیکھی تھی۔ایک خوش پوش جدید لباس میں ملبوس خاتون سامنے سے آ رہی تھیں۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور فوراً شاپنگ سینٹر کا پوچھا۔ انہوں نے اشارے سے کہا کہ اُن کو انگریزی نہیں آتی ہے۔ میں نے جرمن میں پوچھنے کی کوشش کی تو پھر ایک لمحے کے لئے اُس نے مجھے دیکھا اور اطالوی اور انگریزی کا مرقع بنا کر کہا۔شاپن چنتر و؟؟ پلازو۔۔۔تری کلومیترو۔۔۔۔اور داہنی طرف اشارہ کر دیا۔ مجھے ایسا لگا کہ شاید کچھ قسم کی گالیاں پڑ رہی ہیں مگر وہ بڑی خوش ادا سے مسکرائیں اور ''گراسیا'' کہتے ہوئے آگے بڑھ گئیں۔عورت کو شاپنگ سینٹر کا نہیں پتہ نہ جانے کس زمانے کی مخلوق ہے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا اور پیدل کافی دور تک چلتی رہی۔دو تین کلومیٹر کے بعد داہنی جانب ایک شاپنگ سینٹر نظر آ ہی گیا۔مگر لمبی چہل قدمی کے بعد اب شاپنگ کرنے کی ہمت نہیں تھی۔لہٰذا سامنے آتی بس میں بیٹھ

کر اپنی عارضی آماجگاہ کی جانب بڑھ گئی۔

وریسے ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ یہ چھوٹا سا خوبصورت شہر پہاڑوں کی اونچائی پر ہے جس کے اطراف میں لوگانو دریا بہتا ہے۔ یہاں سے سوئیز رلینڈ کی سرحد ملتی ہے ، یہاں انگریزی کے مقابلے میں لوگ سوئیس جرمن زبان سے زیادہ واقف ہیں جو کہ اسی فیصد جرمن زبان ہے۔ شہر میلان وریسے کے ساتھ جڑا ہوا ہے بنیادی طور پر میں سارا دن میلان میں ہی ہوتی ہوں۔ میرا ریسرچ سینٹر اور یونیورسٹی وہیں ہے۔ میلان کو آبادی، تعلیم، ثقافت، صنعت کے لحاظ سے اٹلی کا اہم شہر مانا جاتا ہے۔ یہ شہر اپنی آبادی، تعلیم، اور تہذیب وثقافت کے لحاظ سے ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں یورپ کا مقبول انٹرنیشنل کانفرنس سینٹر ہے جہاں دنیا بھر سے لوگ مختلف موضوعات پر سیمنار اور کانفرنس میں شرکت کے لئے آتے ہیں۔ سب سے اہم یہاں کی آرٹ اکیڈمی ہے۔ جو سرکاری اور نجی سطح پر آرٹ کے طالب علموں کے لئے فنی تعلیم وتربیت کا اہتمام کرتی ہے۔ میں صبح صبح ہر روز بچوں کو آرٹ بیگ اُٹھائے اسکول کی جانب دوڑتا دیکھتی تو بہت اچھا لگتا۔ جب بچپن ہی سے اپنے ورثے کی حفاظت کے لئے تربیت ہوتی رہے اور اُسکی آبیاری کے لئے ذوق وشوق بڑھایا جاتا رہے تو ظاہری بات ہے کہ وہاں فن کی اہمیت اور قدردانی بہترین فنکار اور لازوال فنون کو جنم دے گی۔ شاید اسی لئے اٹلی کو فن وثقافت کا کعبہ بھی کہا جاتا ہے۔ ملک بھر میں جگہ جگہ فنی تعمیرات سے لیکر شہر کی سجاوٹ، باغات کی آرائش اور بازاروں کی تذین کو فنی سطح پر نہایت مہارت سے ایک خاص شکل دی گئی ہے۔ شہر میلان اٹلی کی بنیادی فنی تربیت کی آماجگاہ ہے اور یہاں سے تربیت شدہ اور تعلیم یافتہ لوگ پوری دنیا میں اپنا لوہا منواتے ہیں۔ اس کے علاوہ لباس اور ٹیکسٹائل ڈیزائننگ میں بھی یہ یورپ میں ایک خاص مقام کا حامل ہے۔ میلان شہر اور اس کے اطراف کے تمام حصے جو صوبہ لمبارڈا میں آتے ہیں، جدید لباس کی تراش خراش اور تذین میں دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ فرانس

جہاں یورپ اور پوری دنیا میں فیشن موسم اور زمانے کے حساب سے ترتیب دیا جاتا ہے، اس کے لئے بھی اٹلی بالخصوص میلان میں مال تیار کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اٹلی کے جوتے بھی اپنی پائیداری، ساخت اور انفرادی ڈیزائننگ کی وجہ سے دنیا بھر میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے۔ سبزیوں، پھلوں، اناج اور میوہ جات کی کاشت کے حوالے سے بھی یہ ملک نہ صرف خود کفیل ہے بلکہ تجارت کے زمرے میں بھی یورپ کا کامیاب ترین درآمدی ملک کہلاتا ہے۔ شہر میلان اٹلی کا سب سے زیادہ سرمایہ فراہم کرنے والا شہر اور صوبہ ہے۔ یہاں کی مصنوعات ساری دنیا میں سرمایہ کاری کرتی ہیں۔ میلان کو اٹلی کے معاشی ڈھانچے کی ریڑھ کی ہڈی بھی کہا جاتا ہے۔ مگر اس کے باوجود یہاں کے لوگوں کا کہنا ہے کہ ہمارے صوبے کے ساتھ ملک میں نہایت ناروا اور سوتیلا نہ سلوک کیا جاتا ہے۔ ٹیکس کی چھوٹ اور دیگر سہولیاتِ زندگی میسر کرنے کے حوالے سے حکومت ہمیشہ دارالحکومت روم کا ساتھ دیتی ہے۔ کیونکہ روم، ٹوسکانہ، فلورنس اور وینس سیاحوں کی دلچسپی کے شہر ہیں۔ وہاں سہولیاتِ زندگی میلان کے مقابلے میں زیادہ میسر ہیں۔

میلان میں قدم رکھتے ہی ہمیں ان تمام معلومات کے ساتھ اس بات سے بھی آگاہ کر دیا گیا تھا کہ یہاں چوری چکاری اور دھوکہ دہی اتنے زوروں پر ہے کہ کھڑے کھڑے آپکا بازار میں سودا ہو جائے اور آپ کو پتہ ہی نہ چلے۔ لہٰذا اپنی قیمتی چیزیں ضروری دستاویزات کو گھر یا ہوٹل میں با حفاظت رکھوایئے یا خود رکھیئے، جیب کتروں کی شہر میں بھرمار ہے۔ دنیا بھر کے ٹھگ بھی یہاں اپنے فن کا بہترین مظاہرہ کرتے ہیں۔ شہر کے اس منفی پہلو سے جب آگاہی ہوئی تو ایک طرف حیرت ہوئی اور دوسری طرف اطمینان بھی کہ ہم تو پاکستانی ہیں اور ٹھگوں، ڈاکوؤں اور لٹیروں کو اپنی سیاست، وزارت اور زندگی کے تمام شعبوں میں بھگتنے کا تجربہ رکھتے ہیں۔ ہمیں تو تمام احتیاطی تدابیر کا بخوبی علم ہے۔ مگر اس دو ڈھائی ہفتے کے قیام کے دوران ایک دن

بھی موبائل فون چھیننے یا پستول دکھا کر لٹنے کا تجربہ باکرمِ الہیٰ نہیں ہوا۔ میں نے ایک اطالوی تحقیقی کولیگ سے ایک دن اس بات کا تذکرہ کیا تو وہ مسکرا کر کہنے لگا کہ ارے پاکستان کے ٹھگ اور لٹیرے تو بڑے پیمانے پر کام کرتے ہیں سڑکوں سے لیکر وزارتوں تک اُن کی رسائی ہے جہاں وہ بیٹھ کر عوام کو لوٹتے ہیں۔ پاکستان میں جرائم کا تناسب یہاں سے کہیں زیادہ ہے۔ یہاں انسانی جان کی قیمت بہر حال ایک موبائل فون یا بٹوے میں رکھی حقیر رقم نہیں ہے۔ اس معاملے میں تو ابھی خدا کا شکر ہے کہ لوگوں کو اس بات کا شعور ہے کہ انسانی جان اس کرہء ارض کا سب سے قیمتی اثاثہ ہے۔ اس کو بے دریغ ضایع کر کے سوائے عذابِ الہیٰ کے کچھ اور ہاتھ نہیں آنے والا۔ جرائم کی دنیا میں بھی مذہبی تعلیمات۔۔۔ میں نے مسکرا کر بنا کچھ کہے اُس کی بات قبول کر لی۔ انسٹیٹیوٹ کی عمارت کے عین سامنے والے گرجا گھر سے اُسی وقت گھنٹیاں بجنے کی آوازیں آنے لگیں۔

گرجا گھر کے حوالے سے بھی میں ایک بات کا تذکرہ کرونگی کہ یہاں ہر محلے میں ایک چھوٹا سا گرجا گھر موجود ہے اور علاقے میں ایک بڑا سینٹرل چرچ بھی ہے۔ مذہب کے حوالے سے یہاں کے لوگ خاصے باشعور ہیں۔ دنیا میں اٹلی کو عیسائیت کا مرکز بھی مانا جاتا ہے۔ یہاں ۸۲،۲ فیصد لوگ کیتھولک ہیں ۔۲،۱۶ فیصد لوگ یہاں ایسے بھی ہیں جن کا تعلق کسی بھی مذہب سے نہیں ہے جو کہ زیادہ تر نوجوان ہیں اور چرچ کے ٹیکس کی چھوٹ حاصل کرنے کے لئے بھی بظاہر لادینیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ساڑھے تین فیصد لوگوں کا تعلق دوسرے مذاہب سے ہے جن میں بڑی تعداد مسلمانوں کی ہے۔ کیتھولک فرقے کے روحانی پیشوا جو پوپ کہلاتے ہیں، وہ بھی اٹلی کے ملحقہ شہر ویٹی کن سٹی میں رہائش اختیار کرتے ہیں۔ جہاں کیتھولک عیسائی مذہب کے ماننے والے سالانہ اجتماع میں دنیا بھر سے آتے ہیں۔ یوں بھی میرے تجزیے کے مطابق ہر اتوار کو صبح صبح گرجا گھروں کی گھنٹیاں بجتے ہی لوگ

اپنے اپنے خاندانوں کے ساتھ وہاں کا رُخ کرنے لگتے ہیں اور عبادتوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ میرا قیام جن لوگوں کے یہاں ہے وہ بھی عیسائی کیتھولک فیملی ہے۔ ہفتہ کے درمیان میں ہی میری میزبان خاتون نے مجھے بتا دیا تھا کہ اتوار کو تمام ملازمین کی چھٹی ہوتی ہے اور وہ بھی اپنے خاندان کے ساتھ صبح ناشتے کے بعد چرچ چلے جاتے ہیں۔ آدھا دن باہر گزار کر اور اکثر کھانا وانا کھا کر ہی وہ لوگ واپس سر شام گھر لوٹتے ہیں۔ اتوار کا دن عبادت کا دن ہے اور اگر میں چاہوں تو ساتھ چل سکتی ہوں ورنہ ویک اینڈ کے لئے روم یا کسی دوسرے شہر کے لئے روانہ ہو جاؤں۔ اِس سلسلے میں وہ میری ہر طرح کی معاونت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ میں نے سوچ کر جواب دینے کا کہا۔ دراصل میں یہ عبادت گاہیں اور عبادات کے انداز کو قریب سے دیکھنا چاہ رہی تھی مگر دوسری جانب روم یا دوسرے شہر جانے کی پیشکش بھی خاصی دلچسپ تھی۔ اور یوں بھی ابھی تو ویک اینڈ میں دو چار دن باقی تھے۔ میں نے انہیں اطمینان دلا دیا کہ ویک اینڈ سے قبل ہی میں اُن کو اپنے پروگرام اور ارادے سے آگاہ کر دونگی اور اُن کی مذہبی مصروفیات میں کوئی خلل نہیں ڈالونگی۔

میلان کی یونیورسٹی اور جہاں جہاں بازاروں اور اطالوی گھروں میں میرا جانا ہوا وہاں میں نے عیسائیت کا نشان اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بی بی مریم علیہ السلام کی تصاویر بڑے اعتقاد سے لگی ہوئی ضرور دیکھیں۔ بالکل اِسی طرح جس طرح ہم پاکستان میں دکانوں اور گھروں میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے نام یا صفاتِ الٰہی یا قرانی آیات وغیرہ دیوار پر یا دروازوں پر آویزاں دیکھتے ہیں۔ اکثر بوڑھے افراد چرچ کے سامنے سے گزرتے ہوئے سر اور کاندھوں پر ہاتھ رکھکر کراس کا نشان بناتے ہوئے اپنا مذہبی سلام بڑے عقیدت سے پیش کرتے ہیں۔ بچوں سے لیکر بوڑھوں تک کی زبان پر مذہبی کلمات سننے کو ملتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے اپنے میزبان گھرانے میں رات کے کھانے سے قبل میز پر گھر کے سربراہ کو روزانہ بائبل سے کچھ پڑھتے اور دعا

مانگتے دیکھتی تھی اور اُس کے بعد بڑوں اور بچوں کو یک آواز میں آمین کہنا ہوتا تھا اور اس مختصر عبادت کے بعد کہیں جا کر کھانے کا باقائدہ آغاز ہوتا تھا۔ مجھے یاد آجاتا تھا جب میرے ابا جان بھی ہم سب بہن بھائیوں کے ساتھ کھانا کھاتے تو آداب کو بہت ملحوظِ خاطر رکھا جاتا تھا۔ صاف ستھرے ہاتھوں کی باقائدہ چیکنگ ہوتی تھی پھر بعد میں نوالے بنانے اور چبانے کے قوانین پر سختی سے عمل ہوتا تھا۔ اور ساتھ ہی ''بسم اللہ'' کی دبی سرگوشی میں کھانے کا آغاز ہوتا تھا۔ جرمنی میں کھانے کے آداب کی تربیت میں نے اپنے بچوں کے کنڈر گاٹن میں ہوتی دیکھی۔ جہاں بچے کھانے سے قبل مذہبی کلمات کے بجائے حفظانِ صحت اور اخلاقیات کے اصولوں کے بھی پابند ہوتے ہیں اور کھانے سے قبل ایک دوسرے کو نوشِ جان کی پُر خلوص تمنائیں کر کے کانٹے اور چمچ سے آداب کے ساتھ کھانا شروع کرتے ہیں۔ کھانے کے دوران یا بعد میں ڈکار لینے اور چبانے کی آواز نکلنے کو نہایت بدتہذیبی میں شمار کیا جاتا ہے۔ پانی بھی ایک سانس میں پینے کی ممانعت ہوتی ہے۔ ان آداب واطوار کو بچپن ہی سے عادات کی شکل دے دی جاتی ہے۔ ایسا ہمارے یہاں بھی اکثر گھروں میں ہوتا ہے۔ مگر یہ تعلیمات کسی شادی بیاہ یا دعوت کے موقع پر یکسر بھلا دی جاتی ہے۔ کھانا دیکھ کر ''ٹوٹ پڑو'' جیسے جنگی احکامات ذہن میں گردش کرتے ہوئے ہمیں حرکت دیکر احکامات بجالانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ پھر نہ ہمیں بسم اللہ یاد رہتی ہے نہ ہی ایک دوسرے کو پُر خلوص تمنائیں کرنے کا حوصلہ صرف بھوک اور نظر کی بھوک غالب آجاتی ہے اور کہتے ہیں کہ ''بھوک تہذیب کے آداب بُھلا دیتی ہے''۔

اٹلی میں مذہبی تعلیمات کا معاشرے میں اتنا مثبت اثر اور عمل دخل دیکھ کر میں خاصی متاثر ہوئی۔ ساتھ ہی یہاں آنے کے بعد ہی حقیتاً عیسائی مذہب کی تاریخ اور فلسفے سے بھی بارآور ہوئی۔ عیسائی مذہب بھی چونکہ آسمانی الہامی کُتب پر مبنی ہے لہٰذا میں نے اسلام اور عیسائیت بہت سارے اہم نکات کو یکساں پایا۔ مثال کے طور پر

عبادات میں ایک خدا پر یقین، قیامت پر یقین، جنت و دوزخ پر ایمان، حقوقِ الہیٰ اور حقوقِ انسانیت جیسی بنیادی تعلیمات تقریباً یکساں ہی ہیں۔ حتیٰ کہ ایک خاتون نے بتایا کہ عیسائی مذہب میں بھی عورت کے پردے کا اتنا ہی اہتمام ہے جتنا کہ دین اسلام میں۔ مگر اس حوالے سے مجھے یہاں صورتِ حال یکسر مترادف نظر آئی۔ مذہب اپنی جگہ مگر لباس کے معاملے میں یہاں موسم کی نمائندگی کو اہمیت حاصل ہے۔ بالخصوص خواتین کے معاملے میں جس دن سورج نکلا لباس آدھے ہو گئے۔ جس دن سورج چھپا رہا اُس روز لباس مکمل۔ ایسا لگتا تھا کہ سورج کے اُوپر ہی کوئی پردہ ہے جو جتنا گرتا یا اُٹھتا ہے اسی لحاظ سے لباس کا ناپ تعین کیا جاتا ہے۔ میں ویسے بھی فروری مارچ کے مہینے میں یہاں آئی ہوں۔ بہار کا آغاز ہونے والا ہے۔ مارچ کا اوائل چونکہ سرد موسم کی آخری سانسیں ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی سردی سخت ہو جاتی ہے جیسے سانسیں اُکھڑ رہی ہوں اور کبھی کبھی ہلکی خنک ہوا کے تازہ جھونکوں میں سورج نئی کونپلوں کو زندگی کی توانائی فراہم کرتا دیکھائی دیتا ہے۔ مگر بہار کی اُمیدوں کا سہارا لئے شہر کی گلیاں، باغات اور گھروں کی بالکونیاں گلابی، پیلے اور نارنجی رنگوں کے پھولوں سے سجنا شروع ہو گئی ہیں۔ یہاں مارچ کے آخر سے جون کے درمیان تک موسم سیاحت کے لئے بہترین ہے۔ نہ زیادہ گرمی ہوتی ہے اور نہ زیادہ سردی۔ دن بھی لمبے ہوتے ہیں اور بازاروں میں بھی رونق رہتی ہے۔ کیونکہ اسی دوران نیا فیشن ترتیب دیکر بازاروں میں منتقل کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ نت نئے فیشن میلے، ڈریس شو اور دیگر سالِ گذشتہ کی مصنوعات پر رعایتی لگائی جاتی ہے۔ جون کے آخر سے لیکر ستمبر کے اوئل تک گرمیاں اپنے عروج پر ہوتی ہیں۔ اسکولوں کی بھی گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوتے ہی شہر کی آبادی خالی ہو کر دریاؤں کے کنارے اور سمندر کے ساحل پر آباد ہو جاتی ہے۔ آئس کریم کا کاروبار عروج پر ہوتا ہے۔ بڑے بڑے آئس کریم پارلر جو کہ سردیوں میں کافی اور کیک کے لئے مشہور ہوتے ہیں یک بیک اپنی ہیت ہی بدل

ڈالتے ہیں۔ اس کے علاوہ سیاحوں کی دلچسپی کے تمام سامان بھی ساحلِ سمندر اور دریاؤں کے کنارے اپنا عارضی پڑاؤ ڈال لیتے ہیں۔ اکتوبر سے یہ قافلہ آہستہ آہستہ سمٹنے لگتا ہے اور نومبر دسمبر تو ویسے بھی کرسمس اور اُسکی تیاریوں کے لئے وقف ہوتا ہے۔ صرف جنوری سے مارچ کے درمیان تک مختلف موضوعات پر کانفرنس، نمائیشی میلے اور سال بھر کی تعلیمی اور صنعتی ادارے اپنا لائحہ عمل پیش کرنے کی منصوبہ بندیوں کے لئے کوششوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

میں نے مزاج کے لحاظ سے اطالوی قوم کو پاکستان یا ایشیائی قوموں کے قریب تر محسوس کیا۔ شاید موسم کے لحاظ سے یہاں لوگوں کا مزاج سنورتا اور بگڑتا رہتا ہے۔ یہاں کے لوگ عام بول چال میں بھی ذرا اُونچا لہجہ ہی استعمال کرتے ہیں۔ کہیں سڑک پر ملنے والے دو پُرانے دوست ایک دوسرے کا احوال اس طرح پوچھتے ہیں کہ زبان نہ سمجھنے والے کو یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ چراغِ پا ہو رہے ہیں یا ایک دوسرے سے برہمی کا اظہار کر رہے ہوں۔ خوبصورت بنگلوں سے لیکر عام فلیٹوں کی بالکونیوں تک میں رسّیوں پر کپڑے سوکھتے دیکھ کر مجھے کراچی کے الا آعظم اسکوائر یا گلستانِ جوہر کے جدید فلیٹ بے اختیار یاد آجاتے تھے۔ جرمنی میں یا مغربی یورپ میں بالکونیوں میں یوں کپڑے سکھانا مکانات کی بیرونی زیبائش کی نفی کرتا ہے۔ یہاں زیادہ تر فلیٹوں اور مکانات میں تہہ خانوں میں کپڑے دھونے یا سُکھانے کا الگ انتظام ہوتا ہے یا پھر لوگ ڈرائر کا استعمال کرتے ہیں۔ البتہ اگر گرمیوں کا موسم ہے تو کچھ لوگ اپنے گھر کے پچھلے حصے کے گارڈن کے کسی کونے میں اسٹینڈ پر کپڑے سُکھانے کا بندوبست کرتے ہیں مگر یوں کھلے عام کپڑے سُکھانا پسند نہیں کیا جاتا۔

ایک بات جو مجھے یہاں بہت اچھی لگی وہ یہ کہ اطالوی معاشرہ بچوں کے لئے نہایت کھلا دل اور کشادہ ذہن رکھتا ہے۔ بچوں کے کھیل اور دیگر دلچسپی کا خیال ہر جگہ رکھا جاتا ہے۔ لوگ اپنے بہت چھوٹے بچوں کو پرام اور گود میں لیکر رات گئے تک

ریستوران اور سنیما گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں اور ذرا بڑے بچے بھی اکثر ویک اینڈ پہ والدین کے ساتھ رات دیر تک گھومتے پھرتے دیکھائی دیتے ہیں۔ یہاں بچوں سے مشفقانہ روّیہ اور دوستانہ ماحول جرمنی کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں جرمنی نئی نئی آئی تھی تب بچوں کی آوازیں اور کھیل کود کے شور کو شہر کی گلیوں کوچوں میں شہر کی رونق میں کمی کے طور پر واضح محسوس کرتی تھی۔ جرمنی میں لازماً بچے کو زیادہ سے زیادہ تین سال کی عمر میں کنڈر گارٹن میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی کام کرنے والے اور پڑھائی کرنے والے والدین کو یہ اختیار اپنے بچوں کی پیدائش کے چھ ہفتے بعد ہی سے حاصل ہے۔ مگر عموماً لوگ اپنے بچوں کو اُس وقت ہی کنڈر گارٹن بھیجتے ہیں جب وہ چلنا سیکھ جاتے ہیں اور تھوڑا بہت بولنا بھی شروع کر دیتے ہیں۔ صبح آٹھ بجے سے سہ پہر ساڑھے تین بجے تک بچے کنڈر گارٹن میں ہی ہوتے ہیں۔ اُس کے بعد اگر موسم اچھا ہے تو باہر پارکوں میں ایک آدھا گھنٹہ کھیلتے ہیں ورنہ مائیں سیدھا گھر لے جا کر اسپورٹس، میوزک یا ٹی وی دیکھنے میں کچھ وقت گزار کر شام سات سے آٹھ بجے کے درمیان اپنے اپنے کمروں اور بستروں میں گھُس جاتے ہیں۔ اٹلی میں نظر آنے والے بچے جرمن بچوں کے مقابلے میں ذرا زیادہ صحت مند نظر آئے شاید کنڈر گارٹن میں مختلف کمپنی کچن کے بنائے کھانوں میں لذت اور غذائیت کی کمی ہے یا اٹلی میں ممتا کا پیار گھر کے کھانوں میں زیادہ ہے جس کی وجہ سے یہ تفریق صاف نظر آتی ہے۔ نومبر ۲۰۱۰ء میں میونخ اور اٹلی کے ایک سائنسی ریسرچ سینٹر میں یورپ کے آٹھ ممالک کے دو سے دس سال تک کی عمر کے بچوں پر ایک رپورٹ شائع ہوئی تھی جس کی تحقیق کے مطابق اٹلی کے بیالیس فیصد بچے یورپ کے اُن منتخب کردہ آٹھ ممالک کے مقابلے میں موٹے ہیں جبکہ جرمنی میں یہ تعداد صرف سولہ فیصد ہے۔ بچوں کی صحت قائم رکھنے کے لئے اور موٹاپے سے بچاؤ کے لئے شہر میں جگہ جگہ چائلڈ اسپورٹس سینٹر موجود ہیں۔ مگر ہمیں یہ سرخ سرخ گالوں

والے صحت مند بچے بہت پیارے لگے۔ جرمن بچے بھی بہت پیارے ہوتے ہیں مگر ان پیارے بچوں کے پیار جتانے یا اُن بچوں کے ساتھ بات چیت کی اجازت آپ کو صرف اُسوقت ہی حاصل ہے جب آپ اُس کو یا اُس کے والدین کو جانتے ہوں۔ بنا جان پہچان کے بچے کے سر پر ہاتھ رکھنا یا گالوں کو چھونا یا انگلی تھام کر پیار کرنا آپ کو جرمنی کے حوالات کی سیر کرواسکتا ہے یا بچے کو مستقبلِ قریب میں ہونے والی کسی بیماری کا مکمل ذمہ دار بنا کر آپ کو قانونی وسماجی سزا کا حق دار بھی بنا سکتا ہے۔ یہاں بچوں کو بھی کنڈر گارٹن سے سکھا دیا جاتا ہے کہ کسی غیر سے نہ ہم کلام ہو اور نہ ہی کسی غیر کو ہم کلام ہونے کا موقع دو۔ بچے بیچارے بہت کم عمری سے ہی یہ سبق ازبر کر کے چوکنا ہو جاتے ہیں اور ایسی غیریت کا عملی سلوک پیش کرتے ہیں کہ آپ اُن کے رویے سے حیران ہو جائیں۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب مجھے برلن میں آئے صرف چند دن ہوئے تھے۔ شہر میں بچوں کے شور وغُل کی کمی کو میں بری طرح محسوس کر رہی تھی کہ ایک دن اسٹوڈنٹ ہاسٹل کی لفٹ میں ایک خاتون ایک دو ڈھائی سالہ بچی کو لیکر سوار ہوئیں۔ سنہرے بالوں کے ساتھ گوری رنگت پہ گلابی گال اور نیلی آنکھوں والی وہ ننھی سی بچی کوئی جیتی جاگتی گڑیا لگ رہی تھی۔ میں نے بلا اختیار اُس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ کتنی پیاری بچی ہے!!! مگر شرمانے کے بجائے وہ سہم کر اپنی ماں کے پیچھے چھپنے لگی ساتھ ہی ماں غصے میں آگ بگولہ ہوتی ہوئی انور سے جرمن زبان میں کچھ بڑبڑانے لگی۔ مجھے لگا کہ انور اُس سے معافی کے درخواست گزار ہو رہے ہیں۔ معاملہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ انور جلدی سے اگلی منزل پر ہی مجھے لیکر اُتر گئے۔ سیڑھوں پر بقیہ سفر طے کرتے ہوئے انہوں نے مجھے سمجھایا کہ یہ پاکستان نہیں ہے کہ تم ہر بچے کو بلا اجازت ہاتھ لگا کر پیار کرلو۔ اُس بچی کی ماں کا کہنا تھا کہ تم ابھی پاکستان سے آئی ہو اور کیا خبر کیا بیماری ساتھ لائی ہو یا فی الحال ہاتھ ہی صاف نہ ہوں اور تم بحیثیت ایک غیر بلا اجازت اُس کی بیٹی کو ہاتھ لگا رہی ہو جو کہ سراسر غلط و غیر قانونی ہے۔

یہ اسٹوڈنٹ ہاسٹل ہے اس لئے بات آئی گئی ہوگئی ورنہ لینے کے دینے بھی پڑ سکتے تھے۔آئندہ کے لئے محتاط رہنا۔یہ سن کر تو مجھے سانپ سونگھ گیا۔ مجھے کراچی کی سڑکوں پر کھیلنے والے بچے یاد آ گئے جو گلیوں میں شور مچاتے پھرتے تھے کرکٹ کھیلتے ہوئے اگر بال بار بار گھر کے اندر آتی تو اُن بچاروں کو ہماری ڈانٹ بھی سننا پڑتی تھی یا کوئی چھوٹا موٹا سودا سلف لانے کی درخواست کے بعد انکے گالوں پر چٹکی اور ایک ٹافی انعام کے طور پر ان کو دیتے تو وہ گرویدہ ہی ہو جاتے یا یونیورسٹی اور کالج میں بس یا ویگن میں سفر کرتے ہوئے جب کوئی عورت ایک دو بچوں کے ساتھ سوار ہوتی تو ہم بخوشی ایک بچے کو اپنی گود میں بٹھا لیتے اور اُسکی توتلی زبان میں اُس کا انٹرویو لیکر خوش ہوتے اور اُن بچوں کی ماں بھی محبت اور تشکر بھری مسکراہٹ کے ساتھ کوئی نہ کوئی لقمہ لگاتی رہتی۔ عجیب ہے یہ جرمن قوم! مگر اٹلی میں مجھے ایسا محسوس نہیں ہوا۔ایک روز میں نے دیکھا کہ ایک درمیانی عمر کا جوڑا ریستوران میں اپنے تین بچوں کو لیکر داخل ہوا۔خاتون ویٹر نے جلدی جلدی بچوں کی جیکٹ اُتارنے اور بعد میں کُرسی پر بٹھانے میں مدد کی اُسکے بعد رنگین پینسلیں اور کاغذ لا کر اُن کے سامنے رکھ دیئے مگر بچے آئسکریم کھانے کے لئے شور مچا رہے تھے۔ویٹر کے ساتھ ساتھ ریستوران کے کاؤنٹر پر کھڑا اُسکا مالک بھی مُسکرانے لگا اور ذرا سی دیر کے بعد بچوں کی آواز میں آواز ملا کر آئسکریم کا مطالبہ کرنے لگا۔اتنے میں دوسری ویٹر چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں آئس کریم سجائے بچوں کی میز کی جانب آ گئی۔سارے بچوں کی توجہ یک بہ یک اُسکی طرف مبذول ہوگئی۔اس فیملی کی برابر والی سیٹ پر ایک بوڑھا آدمی کافی کی چسکیاں بھر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ بڑے انہماک سے سارا منظر دیکھ رہا تھا۔اُس نے اچانک اپنی بسکٹ کی پلیٹ اُن بچوں کی جانب بڑھا دی۔بچوں کے والدین نے شکریہ ادا کرتے ہوئے وہ بسکٹ قبول کر لئے۔خاتون ویٹر نے سب سے چھوٹی بچی کے گال پر پیار سے ہاتھ لگاتے ہوئے ایک آئسکریم کا کپ اُسکی طرف بڑھایا تو پہلے وہ شرما کر اپنے باپ کے سینے

میں اپنا مُنہہ چھپانے لگی مگر چند لمحوں بعد ہی بڑے اشتیاق سے آئس کریم کے کپ میں جھانکنے لگی۔ میں اس منظر کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اگر یہی بچے شور مچاتے ہوئے برلن کے کسی ریستوران میں شام گئے داخل ہوتے تو نقشہ کچھ اور ہی ہوتا بلکہ تین چھوٹے بچوں کے ساتھ شام گئے کسی ریستوران میں جانے کی کسی والدین کی ہمت ہی نہ ہوتی۔ بچوں کے لئے میکڈونلڈ یا برگر کنگ ٹائپ کے ریسٹورنٹ کے علاوہ چند ہی مخصوص ریسٹورنٹ ہیں جہاں جانے کی والدین ہمت کر پاتے ہیں ورنہ کسی دوسرے ریستوران میں والدین اور بچوں کے لئے کیسا ہتک آمیز رویہ ہوتا ہے اس سے ہم برلن میں رہنے والے بخوبی واقف ہیں۔

اطالوی قوم کا بچوں کے ساتھ مشفقانہ رویہ اس بات کا مظہر ہے کہ مستقبل میں یہ قوم اپنی شناخت، قومیت اور تمدن کے حوالے سے مظبوط تر رکھے گی۔ اٹلی کے لوگ اپنی ثقافت کی طرح اپنی نئی نسل کو بھی اپنا ورثہ سمجھتے ہوئے ہر طرح کا تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ وہ اپنی نئی پود کو اپنی زبان، تاریخ، ثقافت اور مذہب سے لیس کر کے پورے یورپ میں اپنا مستقبل مظبوط تر کر رہے ہیں۔ خاندانی شجرہ بڑھانے اور بہترین سماجی تحفظ کے ساتھ نئی نسل کو پروان چڑھانے کے لئے اٹلی مغربی یورپ میں پہلے نمبر پر ہے۔ جرمنی سمیت یورپ کے تمام مغربی ممالک میں ملک وقوم کے اصل وارثوں کی تعداد کم تر ہوتی جا رہی ہے۔ جرمنی تو اِس سلسلے میں نہایت فکر مند ہے۔ جرمنی پورے یورپ میں اپنے باسیوں کے بچوں کی پیدائش اور پرورش کے معاملے میں سب سے زیادہ مالی امداد کرتا ہے۔ اس امداد سے اصل اور نجب الطرفین جرمن نسل زیادہ مستفید نہیں ہو پاتی مگر دوسری قومیت سے مخلوط جرمن اور غیر ملکی اس سہولت سے خاصے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ ایک سروے کے مطابق آئندہ کچھ برسوں میں جرمنی میں صرف غیر ملکی نژاد جرمن افراد ہی اس ملک و قوم کی باگ ڈور سنبھالنے اور بسنے والے ہونگے اور اصل جرمن یا نجب الطرفین جرمن والدین کی تعداد آٹے میں نمک

کے برابر رہ جائے گی۔ مجموعی طور پر بھی جرمنی اپنے بچوں کے لئے سماجی، طبی و تعلیمی سہولیات کے حوالے سے نہایت پرکشش منصوبے پیش کرتا ہے جسکی نہ صرف حکومتِ داخلہ کفالت ہی کرتی ہے بلکہ کشادہ دلی سے قابلِ عمل بھی بناتی ہے۔ مگر ان تمام سہولیات کے باوجود بھی یہاں کے ستر فیصد سے زیادہ لوگ لاولد ہیں۔ اِسکی ایک بنیادی وجہ شاید یہ بھی ہے کہ دوسری جنگ عظیم سے قبل ہی ہٹلر کے دورِ حکومت میں بیشتر عورتوں کی زندگیوں کو ''۳ک'' تک وقف کر دیا گیا تھا۔ پہلا ''ک'' کنڈر یعنی بچے دوسرا ''ک'' ''کیوشے'' یعنی کچن یا باورچی خانہ اور تیسرا ''ک'' ''کرشے'' یعنی چرچ یا گرجا گھر۔ ان تین ک کے تحت نہ صرف عورتوں کو گھروں میں قید کر دیا تھا بلکہ سماجی طور پر بھی ان کی زندگیوں کو زبردستی گھر کی چہار دیواری سے چرچ تک محدود کر دیا گیا تھا۔ رفتہ رفتہ جب جرمنی میں عورتوں کے حقوق کے لئے آواز اُٹھائی گئی تو متعدد عورتوں نے احتجاجاً ان تینوں ''ک'' کو اپنی زندگیوں سے تلف کرتے ہوئے ایک نئے ک یعنی ''کیریر'' کو خوش آمدید کہا اور اپنی تعلیم اور تربیت کے ساتھ ساتھ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لئے گذشتہ تین کیریر کو خیر باد کہہ دیا۔ آج اپنی زندگی کو مظبوط بنانے کے لئے اس کیریر کے گرد تانے بانے باندھتے ہوئے یہ جرمن عورت کہاں تک کامیاب ہے، اس پر روشنی ڈالنے کے لئے شائد ایک مزید کتاب لکھی جاسکتی ہے لیکن اس ملک وقوم میں بچوں کی عدم دستیابی کے باعث کمزور مستقبل، ریستوران وڈھابوں کی بھرمار اور کیمیکل اجزاء سے تیار شدہ کھانوں سے بیماریاں اور لادینیت سے پیدا ہونے والے معاشرتی اور جنسی مسائل سے یہ ملک اپنے ہر شعبہء زندگی میں کسی نہ کسی طور پر اپنا محاسبہ کرتے ہوئے اکثر دیکھائی دیتا ہے۔

جرمنی میں جو لوگ شادی یا رشتہء ازدواج کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں تو وہ اس بات کا بھی خصوصی خیال رکھتے ہیں کہ یہ بندھن کہیں اُلجھی گٹھان نہ بن جائے۔ لہٰذا اس بندھن میں بندھنے سے قبل ہی بندھن کھولنے کے عمل پر تفصیل سے

معاہدہ طے پا جاتا ہے۔ آنے والے بچوں کی تعداد سے لیکر اُن کی کفالت کی ذمہ داری اور پرورش کے فرائض وحقوق کے نکات آپس میں مل بیٹھ کر طے کر لئے جاتے ہیں۔ جو لوگ قوی حوصلے اور مستحکم نظریات والے ہوتے ہیں وہ ہی اپنی اس ناؤ کو تمام بوجھ سمیت پار لگا ہی لیتے ہیں اور کچھ لوگ سوجھ بوجھ اور پلاننگ میں ہی وقت کی ڈور اتنی لمبی کھینچ لیتے ہیں کہ فطری عمل سے پیدائش اور افزائش کا عرصہ ہی گذر جاتا ہے۔ ایسے میں وہ ایک بار پھر اُن غریب ممالک سے رابطہ کرتے ہیں جو بچوں کی پیدائش کے حوالے سے نہایت امیر ہوتا ہے مگر پرورش کے حوالے سے غُربت کی سب سے نچلی سطح پر۔ یہ لوگ اِن غریب ممالک سے بچے گود لیکر اپنی ممتا اور پدرانہ شفقت کی تسکین کرتے ہیں اور ایک مکمل خاندان رکھنے کی صورت میں ٹیکس کی چھوٹ کی سہولیات سے بھی بہرہ مند ہوتے ہیں۔ یعنی ایک ٹکٹ میں دو مزے۔

مگر افسوس کی بات صرف یہ ہے کہ گذشتہ نسل کے اس غلط فیصلے سے سبق حاصل کرنے کے بجائے اگلی نسل بھی اسی راہ پر گامزن دیکھائی دیتی ہے۔ عورتوں کو اُن کے حقوق کے حوالے سے لڑی جانے والی اِس جنگ میں عورتیں ہی اب تک اپنا استحصال ہوتا ہوا محسوس کر رہی ہیں۔

مردوں کے بالمقابل یہاں عورتوں کے حقوق کم ضرور ہیں مگر سلب یا غصب نہیں کئے گئے ہیں۔ آٹھ مارچ جو کہ عورتوں کا عالمی دن ہے اس کی ابتداء بھی جرمنی ہی سے آج سے سو سے زائد برس پہلے ہوئی تھی۔

اٹلی میں مگر خواتین اپنی قوم کا حال سنوارنے کی ترکیبیں اور مستقبل پُرکشش بنانے میں اپنی مثال آپ ہیں۔ وہ اپنے بچوں کی پرورش خود اپنے ہاتھوں سے کرنے کو ہر لحاظ سے ترجیع دیتی ہیں۔ آزادی یا حقوق کے حوالے سے اُن کا نظریہ بالکل مختلف ہے۔ خاندان اور اُسکی اہمیت اٹلی میں ہر راہِ زندگی میں سب سے اول درجہ رکھتی ہے۔ جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت یہاں مختلف جنریشن کے لوگ ایک ساتھ ایک چھت

کے نیچے سانجھے داری کے ساتھ کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ بچوں کی پیدائش سے لیکر اُنکی پرورش، تعلیم وتربیت، شادی بیاہ اور اگلی نسل کی آمد تک خاندان کا بزرگ فرد بحیثیت سربراہ اپنے تئیں فرائض ادا کرتا دکھائی دیتا ہے جبکہ خاندان کے دوسرے افراد تابعداری کے ساتھ اُسے سربراہ تسلیم کرتے ہیں۔ اکثر دکانوں، چھوٹے ریستورانوں اور اسی قسم کی دیگر جگہوں پر جہاں لکھت پڑھت کے کام کم ہی ہوتے ہیں وہاں اکثر بوڑھی مائیاں کام کرتی دکھائی دیتی ہیں جو کہ نہ صرف آپ کی خدمتگار بلکہ آپ کے لئے ایک ناصح اور چارہ گر کا بھی کردار نبھا رہی ہوتی ہیں۔ وریسا شہر کی اسٹیڈیم روڈ پر اسپورٹس کلب اور دیگر چھوٹے موٹے ریستوران ہیں۔ میں فارغ اوقات میں کبھی کبھی موسم کے مزاج اور اپنے دل کی آمادگی کی سنگت میں اس لمبی سڑک کے کنارے ٹہلتے ہوئے نکل جایا کرتی تھی۔ اس سڑک کے ایک طرف ایک بڑا شاپنگ سینٹر بھی ہے جسکی اوپری منزل میں دفاتر ہیں اور باہر کی جانب چھوٹے موٹے ریسٹورنٹ اور کافی ہاؤس ہیں۔ اگر میں کبھی کبھار کافی پینے کسی روایتی کیفے میں چلی جاتی تو اکثر ایک بوڑھا آدمی چائے پیش کرنے کی خدمت پر معمور ہوتا اور ایک بوڑھی عورت خزانے یعنی کاؤنٹر پر بیٹھی کروئشیے سے یا اون سے کچھ بُن رہی ہوتی تھی۔ یہ خواتین اکثر اپنی میزبانی کے دوران آپ کا ہجرہ وشجرہ، ملک وقومیت، بچوں کی تعداد ،شوہر کا رویہ اور سسرال کی کیفیت معلوم کرنے کے بعد اپنی قیمتی آراء اور مفت مشوروں سے ضرور نوازتی ہیں۔ کاؤنٹر کے اطراف میں اُنکی جوانی کی اور بچوں کی تصویریں بھی لگی ہوتی تھیں جن کو دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ خاندان ان کے لئے کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ میں کافی کی قیمت ادا کرنے جب کاؤنٹر کی جانب جاتی تو اپنے کام میں مگن وہ بوڑھی عورت سر اُٹھا مجھ کو دیکھتی اور مسکرا کر پُرخلوص خواہشات کے ساتھ مجھے خدا حافظ کہتی۔ ایک روز وہ کاؤنٹر پر رکھی بچوں کی تصویر کی جانب اشارہ کر کے بڑے فخر سے بتانے لگی کہ یہ اُس کے خاندان کی تصویر ہے۔ پھر اشاروں کنایوں میں مجھ سے

میرے خاندان اور اُن کے بارے میں پوچھا۔ میں نے ٹوٹی پھوٹی اٹالین میں بتایا کہ ''ڈوئے بمبینی'' یعنی دو بچے ۔ میرے اس مختصر جواب پر خوش ہو کر نہ جانے کتنی ساری دُعاؤں کے تحفے دے ڈالے ساتھ ہی شوہر اور بچوں کو چھوڑ کر میلان آنے کا سبب دریافت کیا میں نے صرف کانفرنس کا لفظ ادا کیا اور وہ پورا مضمون جان گئیں مگر اُن کے ادا کئے الفاظ سے زیادہ مجھے بھی اُن کے چہرے کے تاثرات نے ان کی باتوں کا مفہوم سمجھا دیا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ آنکھیں جب ابلاغ کرتی ہیں تو کبھی کبھی لفظ بے معنی ہو جاتے ہیں۔

دوسرے بین القوامی فاسٹ فوڈ چین ریسٹورنٹ میں اکثر غیر ملکی کام کرتے ہوئے دیکھائی دیئے۔ وینس میں بھی میلان کی طرح مجھے بنگالی دوسرے ساؤتھ ایشین کے مقابلے میں زیادہ نظر آئے جو نہایت محنت سے اپنے اپنے کاموں میں جتے ہوئے تھے۔ ان ہی ریسٹورنٹ میں ایک بنگالی لڑکی نے ہمیں بتایا کہ اٹلی میں جنوبی ایشیاء سے آئے ہوئے غیر ملکیوں میں بنگالی ایک کثیر تعداد میں یہاں قیام پزیر ہیں۔ یوں تو تمام بنگالی ہی یہاں کمانے کی غرض سے آئے ہیں مگر جس شہر سے دریا یا سمندر کا گزر ہے اُس کے کناروں کو زیادہ تر بنگالیوں نے اپنی رہائش گاہ بنالیا ہے شاید اس دیارِ غیر میں پانی کی کشش ہی ہمیں یہاں کھینچ لائی ہے۔ اُس کی یہ باتیں سُن کر مجھے میرا بحرہ عرب کے کنارے بسا شہر کراچی بہت یاد آیا۔ اُس روز میں سارا دن کراچی کی یادوں کے سمندر میں غوطہ زن رہی۔

جنوبی ایشیاء کے یورپی زبانوں کے ساتھ تعلقات

اٹلی میں میرا کام برصغیر پاک و ہند اور یورپ کی زبان کے تعلق اور ان کی ارتقاء کے حوالے سے تھا۔ اس دوروزہ کانفرنس کے علاوہ مجھے اردو اور ہندی زبان کا ابتدائی تعارف اور ساٹھ گھنٹے اردو زبان کی مشق بھی کروانی تھی۔ اس شعبے میں طلبہ و طالبات کی تعداد کثیر تو نہیں تھی مگر جو لوگ بھی اس سیمینار میں شامل تھے وہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ اردو و ہندی زبان کے یورپی بالخصوص جرمن زبان کے تعلق اور ارتقائی عمل کے بارے میں جاننے کی جستجو رکھتے تھے۔ ان میں سے بہت سے لوگ اس بات پر حیران بھی تھے کہ جنوبی ایشیاء میں اردو اور ہندی زبانیں اپنے رسم الخط کے لحاظ سے مختلف ہیں اور ان زبانوں کو بولنے والے دو مختلف خطوں کے لوگ تحریری طور پر ابلاغ نہیں کر پاتے مگر زبانی بات چیت کا یہ ابلاغ نوے فیصد سے زیادہ کامیاب ہے۔ نیپالی اور ہندی رسم الخط ایک ہیں مگر ان زبانوں کا ابلاغ دس فیصد بھی کامیاب نہیں ہے۔ جنوبی ہندوستان میں تامل، مشرقی ہندوستان میں بنگلہ شمالی ہندوستان کے صوبے پنجاب میں پنجابی کا نہ صرف الگ الگ اور اپنا رسم الخط ہے بلکہ اُن کا زبانی ابلاغ بھی ایک دوسرے کے ساتھ یکسر جدا ہے۔ زبان کی تاریخ کا یہ ارتقاء نہ صرف ہمیں نہ صرف برصغیر پاک و ہند کی سرزمین میں ایک دوسری قوموں کے ساتھ جڑتا اور جوڑتا نظر آیا بلکہ یہ سلسلہ یورپ تک پھیلا دیکھائی دیا۔

چونکہ جرمنی کی جنوبی سرحدیں بھی اٹلی سے جاملتی ہیں اس لئے وہاں کی سرحدی زبان اطالوی اور جرمن کی ہم آہنگی سے زرا مختلف شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جرمن زبان میں اطالوی الفاظوں کی آمیزش قدرے حد تک زبان کی ہیت بدل دیتی ہے۔اس کے علاوہ یہاں کے لوگوں کا طرزِ زندگی اور مزاج بھی ایک دوسرے کے ساتھ میل کھاتا دیکھائی دیتا ہے۔

میلان یونیورسٹی کی جانب سے منعقد کردہ اس سیمنار میں جہاں جرمنی کی کمیونٹی کے افراد موجود تھے وہاں اردو کے حوالے سے پاکستانی نمائندگان بھی تشریف فرماء تھے۔ایک پاکستانی صاحب جنہوں نے مجھے خود کو پاکستانی سفارتخانے کے محکمہء دفاع کے حوالے سے متعارف کروایا، لیکچر کے بعد مجھ سے ملے اور میرے لیکچر کی بہت تعریف کی۔ بعدازاں انھوں نے سوال کیا کہ میں نے پاکستان کی جانب سے خود کو یہاں متعارف کیوں نہیں کروایا اور جرمنی کے پلیٹ فارم سے کیوں اس سیمنار میں شرکت کی۔اُن کی اس شکایت کے جواب میں میں صرف مسکرا کر رہ گئی۔اب اُن کو کیا بتاتی کہ اب تک ہندی اور اردو زبان کے حوالے سے کوئی بھی تحقیق کار انٹرنیشنل یونیورسٹی لیول پر پاکستان سے نہیں بھیجا گیا ہے۔آخر ہم کب تک جھوٹے نام ونمود کی خاطر کسی دوسرے کی پکی پکائی دیگ پر اپنے نام کا لیبل لگانے کی کوشش کرتے رہینگے۔ ہمارے یہاں اب تک تاریخ اور زبان کے حوالے سے قوم کا تجزیہ اور بٹوارہ صرف سیاسی اکھاڑوں میں ہی ہوا ہے۔ جو لوگ اس سے ملحقہ شعبوں میں سنجیدگی کے ساتھ سرگرمِ عمل ہیں اُن کو تاریخ کا مطالعہ کرنے اور بین الاقوامی رابطہ کرنے کے لئے کانفرنس اور سیمنار تک کی رسائی تو درکنار ان بیچاروں کو تو وہ کتب خانے بھی میسر نہیں ہیں جہاں سے وہ بھرپور مواد اکھٹا کر سکیں۔ چند لمحوں بعد وہ صاحب خود ہی مسکرا کر بولے ارے ویسے بھی میڈیکل اور ٹیکنالوجی سے متعلق شعبہ جات میں ریسرچ وغیرہ کریں یہ سب ویسے بھی وقت اور پیسے کی فضول خرچی ہے۔ابکی بار میرا جواب

مسکراہٹ کے بجائے غصیلی نظروں میں پا کر وہ خود ہی ادھر اُدھر ہو گئے۔ اپنے ملک کے اس نمائندہ کی جانب سے اس طرح کا ردِعمل میرے لئے بہت مایوس کن تھا۔

جرمن زبان اور اُردو زبان عربی کے ساتھ ساتھ دنیا کی مشکل اور پیچیدہ ترین زبانوں میں شمار کی جاتی ہے۔ یہ میرا نہیں بلکہ میرے ایک ساتھی اطالوی محقق کا خیال تھا۔ میں نے اُس کے اس خیال پر غور کیا تو واقعی گرامر کے لحاظ سے تو اُردو جرمن زبان سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔ اب ایک مختصراً مثال لے لیجیے کہ انگریزی میں صرف you یعنی ''تم'' کا تخاطب ہے جرمن زبان میں Sie اور Du زی اور ڈُو یعنی تم اور آپ دونوں اپنے لوازمات اور اقدار کے ساتھ بدرجہ اتم موجود ہیں مگر اُردو میں بات ''آپ سے تم ہوئے اور تو کا عنواں ہو گئے'' تک چلی جاتی ہے۔ اس کانفرنس میں کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ''تو'' کا تخاطب ہندی زبان سے ہدف کر دیا جائے کیونکہ یہ اکثر تعلقات کی قربت سے زیادہ طبقاتی فرق کو ظاہر کرتا ہے۔ مگر در حقیقت ''تو'' کا تخاطب پرانی اطالوی زبان یا لاطینی زبان میں بھی استعمال ہوا کرتا تھا جس کے معنی تم ہیں۔ چونکہ ہندی اور اُردو اِنڈو یورپین زبان کا حصہ ہیں لہٰذا اس کے کچھ الفاظ اپنی ہیت اور معنی کے لحاظ سے یورپی زبانوں کے ساتھ مماثلت رکھتے ہیں۔ اس کی ایک مثال لاطینی زبان میں Deus دیوس کہلاتا ہے جس کے معنی دیوتا یا خدا کے ہیں اسی طرح Cena کھینا کا مطلب بھی کھانا ہے لفظ Pedem پیدم کا مطلب پاؤں ہے یا قدم ہے جو کہ پیدل سے نزدیک تر ہے۔ پیڈل انگریزی کا لفظ بھی یہیں سے آیا ہے۔

زبان کے اس شجرے کو اگر غور سے دیکھا جائے تو یورپ اور جنوبی ایشیاء کی زبانوں کا یہ رشتہ سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔

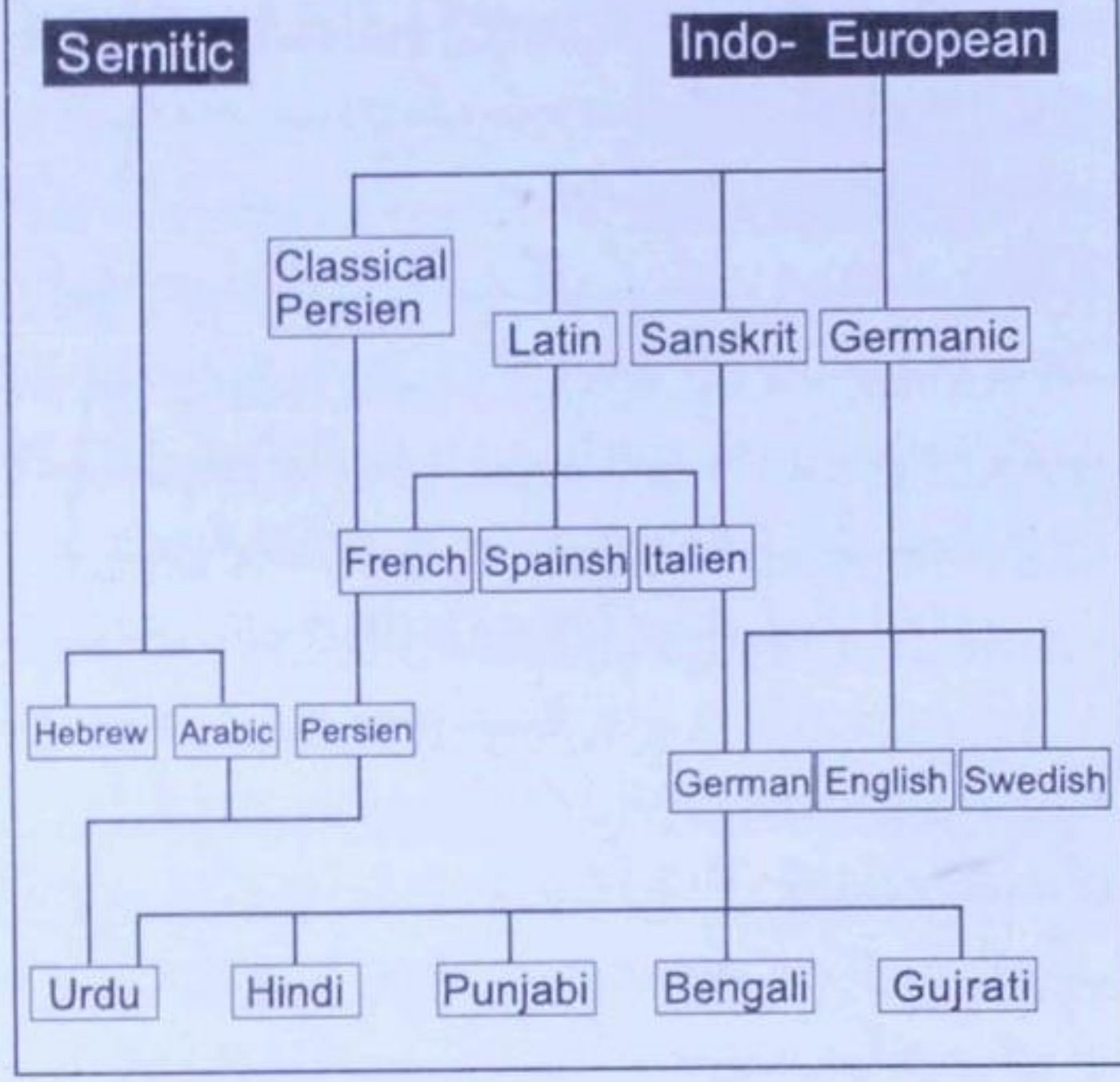

چونکہ جرمنی کی جنوبی سرحدیں اٹلی سے جا ملتی ہیں اس لئے وہاں کی سرحدی زبان جرمن اور اٹالین زبان سے ہم آہنگ ہے اور اسی بنا پر یہ زبانیں لہجے کے لحاظ سے ذرا مختلف شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ جرمن زبان میں وہاں اطالوی الفاظوں کی آمیزش بہت نمایاں ہے۔ کہیں کہیں تو یہی نہیں بلکہ لوگوں کا مزاج اور طرزِ زندگی بھی ایک دوسرے کے ساتھ اس قدر میل کھاتا دیکھائی دیتا ہے کہ معلوم ہی نہیں ہو پاتا کہ یہ ایک جرمن خاندان ہے یا کہ اٹالین۔

جرمنی کے کئی طلبہ وطالبات اٹلی میں قائم کئے گئے تعلیمی اور تحقیقی اداروں اور مراکز میں سرگرم عمل ہیں۔ یہ ادارے اور تعلیمی مراکز زیادہ تر روم، وینس اور فلورنس میں واقع ہیں۔ اٹلی کا اسکول سسٹم یورپ کے تمام اسکول سسٹم جیسا ہی ہے۔ مگر جرمنی کے مقابلے میں یہاں پرائیوٹ اسکولوں کی بھر مار ہے۔ جن میں فیشن، گرافک ڈیزائننگ، فوٹو اور آرٹ ڈیزائننگ کے ساتھ ساتھ فلم اور ٹیلی ویژن انڈسٹری میں بہترین ٹیکنیکی تربیت دی جاتی ہے۔ دوسری طرف ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ منیجمنٹ اور کوکنگ کورسسز کی تعلیم اور پریکٹیکل ٹریننگ کے لئے دنیا بھر سے لوگ یہاں آتے ہیں۔ ان اداروں میں انگریزی میں تعلیم کا رواج ابھی نیا ہی شروع ہوا ہے جو کہ نہایت تیزی کے ساتھ مقبولیت پا رہا ہے۔ اٹلی اپنے پکوان کی لذت اور ذائقے کے حوالے سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہاں کی وائن دنیا بھر میں شوق کے ساتھ پی جاتی ہے۔ ساتھ ہی زیتون، پنیر، کافی پیزا، پاستا اور آئس کریم کے لئے اٹلی کا نام یورپ ہی میں نہیں بلکہ دنیا بھر میں سرِ فہرست ہے۔

اٹلی میں جہاں دنیا بھر کے لوگ جسم کی غذا اور زبان کے ذائقے کی انواع و اقسام کے لئے کھنچے چلے آتے ہیں وہیں روح کی غذا یعنی موسیقی کے حوالے سے بھی خاصی کشش رکھتے ہیں۔ شہرت یافتہ پاپ میوزک اور کلاسیکی موسیقی کے لئے یہ ملک یورپ میں یکساں اور بلند درجہ رکھتا ہے۔ مشہور موسیقاروں اور گلوکاروں میں Zucchero, Eros Ramazzoti, اور Nek کے نام یورپی موسیقی کی دنیا میں اعلیٰ اقدار کے حامل ہیں۔

اسی طرح اگر ادب کی دنیا پہ ایک نظر ڈالی جائے تو دانتے الغیر ائی Dante Alighieri فلورنس کا ایک نہایت مشہور شاعر گزرا ہے جس کی لکھی ہوئی کتاب Divina Comedia یورپی ادب کی دنیا میں ایک لازوال حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب ابتداً مذہبی کتابوں کے زمرے میں لی جاتی تھی جس کی وجہ شاید الہامی کتاب

انجیل کے ایک حصے کی مماثلت ہے۔ درحقیقت یہ کتاب دوزخ سے جنت کی جانب ایک منظوم داستان ہے جس میں جنت کو ۹ مختلف درجات پر پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ۹۰ دوسری تاریخی اور مذہبی رجحانات کی نظمیں اس کتاب میں موجود ہیں۔ یہ کتاب اسکول اور کالج کے طلبہ و طالبات کے تاریخ اور مذہب کے مضامین کے علاوہ ادب اور زبان کے شعبے میں بھی جزوی طور پر نصاب میں شامل ہے۔

اس کے علاوہ بچوں کی کہانیوں کا مشہور کردار پنا کیو Pino Pinocchio بھی اٹلی ہی کے ایک نوبل یافتہ ادیب لوئیگی پیرانڈیلو Luigi Pirandello کا تخلیق کردہ لازوال کردار ہے۔ اس کہانی میں ایک لکڑی کاٹنے اور بحیثیت بڑھئی کا کام کرنے والا جوڑا جو کہ بے اولاد ہے اور ایک روز لکڑی کا ایک انسانی شکل وہیت کا پُتلا بنا کر خدا سے دعا کرتا ہے کہ اس میں ہی جان ڈالکر اسے اُن کی اولاد بنا دے اور جب اُن کی دعا پوری ہو جاتی ہے تو وہ اس لکڑی کے گڈے کو اپنی اولاد کی طرح چاہتے اور پرورش کرتے ہیں اس لکڑی کے انسان میں خدا یہ صفت ڈال دیتا ہے کہ جب وہ جھوٹ بولتا ہے تب اُس کی ناک لمبی ہو جاتی ہے اور زیادہ جھوٹ بولنے پہ یہ ناک لمبی ہی ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ کہانی بچوں میں اتنی مقبول ہوئی کہ اس کا ترجمہ دنیا کی ستر سے زائد زبانوں میں کیا گیا۔ میلان میں بھی اٹلی کے دوسرے شہروں کی طرح ''پنا کیو'' کا مجسمہ بچوں کے کنڈر گارٹن اور کھیل کود کے میدان اور تفریحی مقامات پر جگہ جگہ نصب دیکھائی دیتا ہے۔

مجموعی طور پر اگر آپ موجودہ اطالوی ادب کا سرسری جائزہ لیں تو وہاں لکھنے والے ادیب زیادہ تر جُرم اور حُسن کی دنیا کی داستانیں رقم کر رہے ہیں اور یورپ بھر میں مقبولیت حاصل کر رہے ہیں۔

اس کے علاوہ ادب و ثقافت کے حوالے سے اٹلی کے سفر کی معلوماتی، تاریخی اور رہنما تصویری کتابیں محکمہ سیاحت و ثقافت کے تعاون سے ایک کثیر تعداد میں ایک

تسلسل کے ساتھ شائع ہو رہی ہیں۔ جن کے ترجمے یورپ کے دوسرے ممالک میں بطور ''ٹریول گائیڈ بک'' اکثر کتب خانوں اور بک اسٹال پر دستیاب ہوتے ہیں۔

ٹریول گائیڈ پہ یاد آیا ایک دن میں یونیورسٹی کے بعد ایک بک اسٹال میں کچھ دیر کے لئے گئی کہ اگر کہیں جرمن یا انگریزی زبان میں اٹلی کے مختلف شہروں کی ٹریول گائیڈ بک مل جائے تو میں فیصلہ کر سکوں کہ ویک اینڈ پر کہاں جانے کا پروگرام بنایا جائے۔ کیونکہ ہفتہ اور اتوار کو حسبِ معمول چھٹی ہوگی میں چاہ رہی تھی کہ میلان سے زیادہ دور بھی نہ جاؤں اور کچھ نیا بھی دیکھ لوں۔ ساتھ ہی عمران اور اُسکی فیملی سے بھی ملنا تھا جو ہمارے ایک رفیق نامی دوست کے رفیق ہیں اور طالب علمی کے دوران ہی جرمنی چھوڑ کر اٹلی جا بسے تھے۔ اِن صاحب کو برلن میں ہم سب عمران ٹائٹ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ عمران ایک بار ہمارے یہاں رفیق کے ساتھ تشریف لائے۔ میں نے سندھی بریانی پکائی ہوئی تھی۔ ڈائینگ ٹیبل پر تناول کے بعد عمران نے اچانک کہا کہ '' بہت ٹائٹ ہے'' سب لوگوں نے متوجہ ہو کر اُن کے لباس کی طرف نگاہ ڈالی تو خود ہی فوراً بول پڑے۔۔۔ میرا مطلب ہے بریانی۔۔۔۔ اور پھر خجل سی مُسکراہٹ کے ساتھ کراچی کی سڑکوں پر اور نوجوانوں میں استعمال ہونے والی اُردو کے نت نئے محاروات اور کہاوتوں سے ہمیں روشناس کراتے رہے۔ میز پر بیٹھے ہم سب ہی افراد بعد میں اُردو کی اس چلتی پھرتی نئی لُغت کے بارے میں دیر تک گفت وشنید کرتے رہے اور مسکراتے رہے۔ مجھے رہ رہ کر کسی شاعر کا ایک مصرعہ ذہن میں گونجتا سنائی رہا تھا۔

''اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے''

رفیق نے کہا تھا کہ عمران سے ضرور ملوں اب وہ شادی شدہ اور ایک بچے کا باپ ہو گیا ہے اور اُسکی بیوی کراچی سے میلان آ گئی ہے۔ میں نے سوچا کہ جمعہ کی شب یا ہفتہ کے دن میں کہیں میلان یا وریسے سے باہر جا کر شام کو یا اتوار کی صبح کو عمران سے مل آؤنگی۔ جب میں نے عمران کو فون کیا تو وہ بضد ہو گیا کہ ہفتہ کی رات میں اُس

کے گھر رکوں اور وہ اتوار کا دن ساتھ گزاروں۔اُس کی بیوی نے بھی فون پر بہت اصرار کیا تو مجھ سے انکار نہیں ہوا۔ جمعہ کو کلاس کے بعد میں نے اُسکے بیٹے کے لئے کچھ چاکلیٹ اور کھلونے خریدے اور اس بک اسٹال سے کوئی ٹریول گائیڈ بک لینا چاہ رہی تھی کہ میری میزبان خاتون کا فون آ گیا کہ میں جلدی فارغ ہو کر گھر آ جاؤں کیونکہ ڈرائیور کو آج جلدی جانا ہے اور دوسرا یہ کہ ہفتہ کی ہم صبح صبح وینس جا رہے ہیں چونکہ ہفتہ کو اپنی میزبان خاتون کو اُردو بھی پڑھانی تھی اس لئے انھوں نے فیصلہ کیا کہ ہم وینس آنے اور جانے کے دوران چار گھنٹے اُردو کی مشق کرینگے اور کچھ دیر وینس کی سیر کر لیں گے۔ پیشکش بُری نہیں تھی۔ میں نے عمران کو فون کیا کہ اب ہم صرف اتوار کو ہی ملیں گے مگر وہ بندہ کسی بھی طور اپنی مہمان نوازی میں کمی کرنے پر تیار نہیں ہوا کہنے لگا کہ اگر آپ رات دیر سے آئیں گی تب بھی میں آپکو لینے آ جاؤں گا۔ اُس کا اتنا پُر خلوص اصرار دیکھ کر میں نے وعدہ کر لیا کہ میں وریسے پہنچ کر سب سے پہلے اُسکو فون کروں گی اور جیسا مناسب ہوگا اُس ہی حساب سے مُلاقات ضرور کریں گے۔ فی الحال تو دو دن یونی ورسٹی جانا تھا۔

جمعہ کا دن یونیورسٹی میں عموماً مختصر ہوتا ہے۔ مگر اُس روز خاصی دیر ہو گئی تھی۔ میں نے اپنی میزبان خاتون کو فون کر دیا کہ وہ ڈرائیور اور گاڑی نہ بھیجیں آج میں خود ہی ٹرین سے آ جاؤں گی۔ میلان سے وریسے آخری ٹرین رات دس بجے تک چلتی ہے مگر رات کو ٹرین اسٹیشن سے کوئی بس اُن کے گھر تک نہیں آتی۔ تقریباً دو ڈھائی کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا ٹرین اسٹیشن سے گھر تک کا۔ موسم اچھا ہو اور رستہ انجان نہ ہو تو پیدل چلنے کے لئے یہ فاصلہ کوئی فاصلہ نہیں ہے میرے لئے۔ مگر اُس رات بارش بھی بہت زوروں کی تھی۔ مگر اللہ کا نام لیکر رات دیر تک یونیورسٹی میں رُک گئی۔ سارے کام سمیٹ کر میں اور مسز انجیلا مسواتی اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف چل دیئے۔

اُس شام خاصی ٹھنڈ تھی یا میں بہت تھک گئی تھی اور بھوک بھی زوروں کی لگی ہوئی

تھی۔ میلان کے مرکزی ریلوے اسٹیشن پر آ کر سب سے پہلے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا تو جان میں جان آئی۔ جمعہ کی رات یورپ کے بڑے شہر کی روایتی ویک اینڈ نائٹ تھی۔ ہر طرف لوگ ہی لوگ تھے ہر کوئی کچھ نہ کچھ سامان سنبھالے اپنی منزل کی جانب سفر کرنے کو تیار تھا۔ کچھ تھکے ہوئے چہرے اپنی اپنی ٹرینوں کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ نوجوان لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، ایک دوسرے میں مگن نئی اُمنگوں اور پُر جوش جزبوں کے ساتھ لوگوں کی نظروں سے بے پرواہ اپنے حال و مستقبل کے خواب بُنتے ہوئے سڑکوں پہ شوقِ آوارگی پورا کر رہے تھے۔ ریلوے کے تمام ٹکٹ گھر بند ہو چکے تھے صرف آٹومیٹک مشینوں سے ہی سفر کے لئے ٹکٹ خریدے جا سکتے تھے۔ آٹومیٹک ٹکٹ مشین پر مختلف زبانوں میں بڑے بڑے جلی حروف میں جیب کتروں سے ہوشیار رہنے کی ہدایت لکھی ہوئی آ رہی تھی۔ میں نے ٹکٹ خریدنے کے لئے جرمن زبان کی ہدایت کے بٹن کو دبایا ہی تھا کہ پیچھے سے ایک خاتون نے انگریزی میں بتایا کہ یہ ٹکٹ مشین خراب ہے اور میں اس میں پیسے نہ ڈالوں۔ ٹرین آنے میں صرف پانچ سات منٹ تھے اور مجھے اُس پلیٹ فارم پر بھی پہنچنے کے لئے کچھ فاصلہ طے کرنا تھا۔ میں اچانک آنے والی اس مشکل سے کچھ دیر کے لئے پریشان ہوگئی اور اسی تردد میں میں نے اُن خاتون سے پوچھا کہ پھر اب کیا کیا جائے؟۔

اُنہوں نے فوراً ایک ٹکٹ اپنے پرس سے نکال کر دیتے ہوئے کہا کہ یہ ٹکٹ اُن کے پاس ایکسٹرا ہے اگر میں چاہوں تو تیس یورو میں خرید سکتی ہوں۔ مجھے اچانک ایک کولیگ کی ہدایت یاد آئی کہ یوں اسٹیشن پر کسی انجان سے ٹکٹ نہ خریدنا کیونکہ اکثر وہ جعلی ٹکٹ ہوتے ہیں اور بے شمار ٹھگ ان کی فروخت کے لئے شہر کے ریلوے اسٹیشنوں پر کوشاں رہتے ہیں۔ میں نے اپنے حواس پر قابو پاتے اُن کی پیش کش مسکراتے ہوئے رد کر دی اور کہا کہ پھر آج میں ٹرین میں ہی ٹکٹ خریدنے کی کوشش

PROF. SHARIB RUDAULVI
COLLECTION

کرونگی کیونکہ جرمنی میں تو ٹکٹ ٹرین کے اندر بھی خریدا جاسکتا ہے۔ خاتون نے اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے میری بات پر آمادگی کا اظہار کیا اور اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں خیریت کے ساتھ گھر پہنچنے کی نیک خواہشات کا بھی۔ میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے تیز قدموں کے ساتھ اپنی ٹرین کے پلیٹ فارم کی جانب دوڑ لگادی۔ ابھی گاڑی آنے میں چار پانچ منٹ تھے۔ پلیٹ فارم پر بہت کم لوگ تھے۔ میں بنا ٹکٹ کے سفر کرتے ہوئے گھبرا بھی رہی تھی۔ ایک جوان عمر عورت ایک چھوٹی سی بچی کے ساتھ کھڑی تھی بچی تھکن سے نڈھال تھی اور۔ عورت اُسکو بار بار تسلی دے رہی تھی اب بس ٹرین آنے ہی والی ہے بچی کے ساتھ وہ اپنی گفتگو سوئس جرمن زبان میں کر رہی تھی۔ مجھے تھوڑی سی ڈھارس بندھی کہ کوئی ہے جو مجھے سمجھ پائے گا۔ میں اُن لوگوں کے قریب گئی اور کہا کہ یہاں کی ٹکٹ مشین خراب ہے اور میں ٹکٹ نہیں خرید پائی ہوں کیا یہاں ٹرین کے اندر ٹکٹ خریدا جاسکتا ہے۔ اُس عورت نے حیران ہوکر میری شکل دیکھی اور کہا کہ وہ ابھی ابھی ٹکٹ اُس ہی مشین سے خرید کر آئی ہے۔ مشین بالکل ٹھیک کام کر رہی ہے۔ مگر ٹرین کے اندر بھی چیکر سے ٹکٹ خریدا جاسکتا ہے۔ مگر وہ ٹکٹ زرا مہنگا ہوگا۔ میں نے پوچھا کہ لگ بھگ کتنا مہنگا ہوگا تو اُس عورت کے جواب پر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اُس نے کہا کہ عموماً پانچ یورو کا ٹکٹ ہے مگر ٹرین کے اندر چھ یا سات یورو کا ہوگا۔ میری آنکھوں کے آگے وہ خوش پوش عمر رسیدہ خاتون آگئیں جواب سے کچھ دیر قبل مجھے مشین کے خراب ہونے کی خبر دیکر پانچ کے بجائے تیس یورو میں ٹکٹ فروخت کرنا چاہ رہی تھیں۔ سامنے سے آتی ہوئی ٹرین نے مجھے زیادہ دیر حیران ہونے کا موقع نہیں دیا میں نے پلیٹ فارم پر اس دو منٹ رُکنے والی اُس رات کی اس آخری ٹرین میں تیزی مگر اطمینان سے اپنے قدم رکھ دیئے اور ٹرین وریسے کی جانب سیٹی بجاتی ہوئی روانہ ہوگئی۔ کچھ دیر بعد کسی اضافی پریشانی کے بغیر میں نے ٹکٹ چیکر سے ٹکٹ خریدا اور آخری ٹرین اسٹیشن سے اُتر کر ٹیکسی لی اور کاغذ پر لکھی ایڈریس کی پرچی

ٹیکسی ڈرائیور کو دکھائی تو اُس نے سر جھکاتے ہوئے پچھلی جانب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
میں کچھ دیر کے بعد تیز بارش اور طوفانی ہواؤں سے محفوظ میں واپس اپنے بھوت بنگلے
میں لوٹ آئی تھی۔ مگر آج یہ بھوت بنگلہ خاصی اپنائیت کا احساس دے رہا تھا۔

وینس کی سیر

یہ عنوان تو شاید پانچویں کلاس کی اُردو کی کتاب کے ایک مضمون کا تھا۔ اُس مضمون کو پڑھنے کے بعد پانی پر بسے اس شہر کو دیکھنے کی تمنا دل میں جاگی تھی میں تصور کی کشتی پہ بیٹھے کبھی کبھی اس انوکھے شہر کی سیر کو نکل جایا کرتی تھی مگر تصورات کے خاکے کبھی تعبیر کا روپ دھار لیں گے میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اُس روز مجھے ایک بار دوبارہ ایک دن کے لئے وینس کی سیر کا موقع ملا تھا۔

ہفتے کی صبح آٹھ بجے ناشتے کے بعد میں اور میری میزبان خاتون وینس کے لئے روانہ ہو گئے پہلے ارادہ کیا کہ ٹرین سے جایا جائے مگر بعد میں اچانک اُن کو خیال آیا کہ واپسی پر اُن کو کچھ سامان لینا ہے لہٰذا گاڑی سے جانا ہی بہتر ہے۔ اور یوں بھی ریل کے مقابلے میں گاڑی سے ہم کافی جلدی پہنچ جائیں گے۔ واپسی بھی جلدی ہی کرنا تھی کیونکہ آج رات اُن میزبان خاتون کے بچے چھٹیاں گزار کر واپس گھر آ رہے تھے اور مجھے بھی عمران کے یہاں جانا تھا۔

یورپ میں وینس انور کا اور میرا پسندیدہ شہر ہے۔ ہم شادی کے بعد ہنی مون منانے وہاں جانا چاہتے تھے۔ مگر شادی کے فوری بعد حالات اور مواقع ہی میسر نہ آ سکے۔ انور کو گرمیوں کے سمسٹر کی چھٹیوں میں شادی کے لئے آنا تھا مگر مجھے چھٹیوں

سے پہلے یونیورسٹی جوائن کرنا تھی لہٰذا ویزا ملتے ہی انور اپنے امتحانوں کے درمیان آئے اور دس دن کے اندر اندر عیدِ قُرباں منا کر اور شادی کر کے مجھے برلن لے آئے اور آتے ہی خود امتحان میں جُت گئے اور مجھے بھی جرمن لینگوج کورس میں بھرتی کروادیا تاکہ کچھ ہفتوں بعد یونیورسٹی میں داخلہ آسانی سے ہو سکے۔ پھر یونیورسٹی میں تو داخلہ ہو گیا مگر امتحانوں کے سلسلے ایسے شروع ہوئے کہ ہنی مون کہیں دور ہی رہ گیا۔ پڑھائی، روزگار، خاندانی منصوبہ بندی کے ساتھ وقت کہیں پر لگا کر اُڑتا رہا۔ ہم چھٹیوں میں پاکستان چلے جاتے یا یورپ میں بچوں کی دلچسپی کے تفریحی مقامات کی جانب نکل جاتے ائیر لائین کی سہولت لیتے ہوئے ایک بار ترکی اور زین بھائی کے پاس مسقط ہی جانا ہو سکا۔ وینس تو بس خوابوں کا شہر ہی بن کر رہ گیا تھا۔

۲۰۰۵ء میں جب زین بھائی جان برلن آئے تو اُن کے ساتھ وینس جانے کا پروگرام بنا۔ اُس وقت تک پڑھنے لکھنے اور مستقل روزگار حاصل کرنے کے بعد ہم جرمن قومیت لے چکے تھے۔ سارہ اور مایا تب چھوٹی ہی تھیں۔ اُس وقت تب ہم اپنے کنبے سمیت وینس اپنے خوابوں کے شہر آئے تھے جہاں آتے ہی بچوں کے نیپی اور دودھ کی دکانوں کی تلاش میں نکل پڑے تھے۔ مگر پھر بھی وینس میں گزارے چند دن بہت یادگار رہے۔ چھوٹی بھابھی اور زین بھائی کی سنگت میں یہ سفر بہت یادگار تھا۔

پھر کچھ سالوں بعد میں اس طرح وینس آؤنگی، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ راستے میں میری میزبان خاتون اُردو گرامر کی مشق کرتی رہیں اور میں دلکش نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اُن کی تصحیح اور راہ نمائی کرتی رہی دو ڈھائی گھنٹے کے بعد ہم وینس میں داخل ہو گئے تھے۔

وینس ویسے تو چھ خاص علاقوں میں بٹا ہوا ہے مگر مجھے صرف وینس شہر کی یہ چار خاص جگہیں یعنی کناریگیو San Polo, Cannaregio سان پولو، San Marko سان مارکو اور Castello کاستیلو یاد ہیں۔ ان کی خاص بات یہاں کا

گرجا گھر، ہوائی اڈہ، قدیم محل اور شہر کا اندرونی علاقہ ہے جو اپنی ہیت اور تاریخی مقامات کی وجہ سے اکثر سیاحوں کو یاد رہ جاتا ہے۔ جب ہم پہلی بار وینس آئے تھے تب اتنی گہرائی سے تاریخ اور اُسکے حوالوں سے وینس کو جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی لیکن اب جی چاہ رہا تھا کہ معلوم کیا جائے کہ یہ انوکھا شہر کب اور کس نے بنایا۔ مقامی لوگوں کا کہنا تھا کہ اس شہر کی آبادکاری رومی سلطنت کے مختلف شہروں سے بے دخل کئے جانے والے لوگوں سے ہوئی جن کی بسائی ہوئی بستیوں نے اور اِن ہی لوگوں کے طرزِ تعمیر اور فنون نے ان جزیروں کو آباد کر کے اسے شہر کا درجہ دیا۔ باقاعدہ طور پر اس شہر کی ابتدائی تعمیر اور ترقی پر کوئی خاص اور ٹھوس معلومات تاریخی دستاویزات کی عدم دستیابی کی بنا پر اب تک سامنے نہیں آسکی ہیں لیکن قیاس آرائیوں اور خستہ تاریخی کھوج کے تحت جو بات سامنے آئی ہے وہ یہی ہے کہ رومی سلطنت کے مختلف شہروں سے جن میں یادوعہ، آکوئیلا اور کون کورڈیا کے نام شامل ہیں، کے لوگوں کو بربریوں کے حملوں کی وجہ سے بے دخل ہونا پڑا جس کے بعد یہ لوگ ان جزیروں میں پناہ لیکر رہنے لگے اور وقت گذرنے کے ساتھ رفتہ رفتہ انہوں نے اپنی ان پناہ گاہوں کو باقائدہ ایک معاشرے کی شکل دے دی اور اپنے پیشے اور فنون کی بنا پر دنیا کے افق پر اپنا لوہا منوالیا۔ نہروں جزیروں میں گھرے اس خوبصورت شہر وینس کو دنیا بھر میں مختلف ناموں سے پُکارا جاتا ہے جیسا کہ کھلے پانیوں کا شہر، پلوں کا شہر، روشنیوں کا شہر اور یورپ میں اسے ایڈریاٹک کی ملکہ کے نام سے بھی یاد رکھا جاتا ہے۔ دنیا بھر کے ادب میں شاعروں اور ادیبوں نے اس شہر کے انوکھے پن کو اپنے قلم سے مزید جاویدانی بخش دی ہے۔ اردو ادب کے شاعر احمد فراز بھی اپنی نظم میں استعاراتی طور پر اس شہر کے انوکھے پن کو استعمال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

؎ وینس کا سارا شہر کھلے پانیوں میں تھا۔

ہم گاڑی سے اُتر کر کچھ دیر چل کر ایک ساحلی علاقے کی جانب آگئے جہاں

کچھ اسٹیمر اور لانچز ڈکھے بندھے کھڑے تھے اور دوسری طرف پانی میں قطار سے کھڑے سے درخت کے تنوں سے بندھی وینس کی روایتی ''گونڈولا'' کشتیاں کھڑی تھیں۔اُن کے ملاح قریب ہی سیاحوں کی تلاش میں متجسس نگاہوں سے ہر آنے جانے والے کا جائزہ لے رہے تھے۔اکثر نے وینس کی روایت کو قائم رکھتے ہوئے نیلی اور لال دھاری کی جیکٹیں اور سر پر خاص وینس کے ملاحوں کی ٹوپیاں پہنی ہوئی تھیں۔ میں بھی پُر اشتیاق نگاہوں سے یہ سارا منظر اپنی آنکھوں میں اُتار رہی تھی۔ موسم اس روز بہت سرد تھا مگر پھر بھی دل مچل رہا تھا کہ ان کھلے پانیوں میں جا بجا کھڑی ہوئی کالی لمبی کشتیوں میں جن کے سنہرے اور دلکش ڈیزائین ہیں اور جو یہاں گونڈولا کہلاتی ہیں، میں سیر کی جائے۔ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ میری میزبان خاتون نے بتایا کہ اُن کی اپنی ذاتی موٹر لانچ یہاں موجود ہے اور اُنکا کارڈرائیور ہمیں اس لانچ سے وینس کی سیر کروادے گا۔اُن کا یہ مشورہ تھا یا حکم مجھے نہیں معلوم مجھے تو بس اُن کا کہا ماننا تھا کیونکہ وہ ہی میری میزبان تھیں اور ہمسفر بھی۔۔۔۔میں نے ہمیشہ کی طرح مُسکرا کر قبولیت میں سر ہلا دیا۔انہوں نے میری جانب غور سے دیکھتے ہوئے کہا کہ اگر تم گونڈولا میں وینس دیکھنا چاہتی ہو تو ہم پورا وینس نہیں دیکھ سکیں گے اور یوں بھی ٹھنڈ بہت ہے ہم لانچ میں تو کہیں بھی رُک کر کافی پی سکتے ہیں ایسے موسم میں پانی میں زیادہ دیر نہیں رُکا جاسکتا۔نہیں۔''نہیں۔کوئی بات نہیں جیسا آپ چاہیں'' میں نے فوراً جواب دیا حالانکہ میں ایسی دلچسپ سیر سپاٹوں کی جگہ پر اتنی تعبیداری کا مظاہرہ کم ہی کرتی ہوں۔مگر مجبوری تھی۔اُنکا مشورہ ماننا میرے لئے لازمی تھا۔ ڈرائیور نے ایک لانچ کی جانب بڑھتے ہوئے اطالوی زبان میں میزبان خاتون سے کچھ کہا اور وہ چلتے چلتے کچھ دیر کے لئے رُک کر اُسکی بات سننے لگیں۔پھر میری جانب دیکھ کر کہنے لگیں کہ لانچ کافی دنوں سے بند پڑی ہے شاید تیل پانی چیک کرنا ہو اور ذرا صفائی بھی کرنی پڑے تھوڑا وقت لگے گا جب تک ہم کسی کیفے میں بیٹھ کر کافی پیتے

ہیں۔ہم ایک سامنے ہی کافی شاپ میں بیٹھ گئے ڈرائیور جا چکا تھا۔کافی پیتے ہوئے میں نے تھوڑا جھجکتے ہوئے کہا کہ کیوں نہ ہم واٹر بس یا ٹیکسی سے آگے چلیں آپ لانچ کو رہنے دیں یوں سیر کرنے میں زیادہ مزا آئے گا۔انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ٹھیک ہے جیسا تم چاہو۔ویسے بھی تم میری مہمان ہو اور مہمان کی خواہش کا احترام کرنا ہم اطالوی لوگوں میں بہت اہمیت رکھتا ہے اور فوراً ہی انہوں نے اپنا موبائل فون بیگ سے نکال کر اپنے ڈرائیور کو فون کیا کچھ ہدایتیں دیں۔کچھ دیر بعد ہم وینس کے واٹر بس اسٹاپ کی جانب بڑھ گئے۔

میری میزبان خاتون کا خیال تھا کہ ہفتے کا دن ہونے کی وجہ سے یہاں کام کاج کے لئے آنے جانے والوں کا رش کم ہے مگر میرے حساب سے تو واٹر بس اسٹاپ پر آج بھی کافی رش تھا۔یہ موٹر سے چلنے والی یہ واٹر بسیں یہاں کی عمومی آمد و رفت کے لئے استعمال ہوتی ہیں۔جنہیں مقامی لوگ وایو ریٹی کہتے ہیں۔یہ واٹر بسیں شہر کی نہروں میں ایسے چلتی ہیں جیسے کہ یورپ کے دوسرے بڑے شہروں میں عام بسیں چلا کرتی ہیں۔پیدل چلنے والوں کے لئے اور مختلف علاقوں کو ملانے کے لئے اِن نہروں کے اوپر جگہ جگہ چھوٹے بڑے پُل موجود ہیں۔اِن پلوں پر لوگوں کا ایک جمِ غفیر اُس وقت دیکھائی دیتا ہے جب کوئی مشہور پریڈ نہروں میں ہو رہی ہوتی ہے یا کہ وینس آرٹ بینالے Venice Art Biennly جو کہ وینس کا سالانہ میلہ لگا ہوتا ہے جس میں کشتی رانی کے مقابلے اور ساتھ ساتھ اطالوی فنونِ لطیفہ کی ہر دو سال بعد نمائش کا انعقاد کیا جاتا ہے۔یہ نمائش ستمبر کے مہینے میں کی جاتی ہے۔اس کا آغاز سن اٹھارہ سو تیراسی میں کیا گیا تھا بعد میں اس کو یورپ کی سیاسی صورتحال اور جنگ کی وجہ سے روک دیا گیا تھا۔بعد میں دوسری جنگِ عظیم کے بعد اس نمائش کا باقائدہ آغاز سن اُنیس سو اڑتالیس میں دوبارہ کیا گیا جو کہ اب تک جاری ہے۔پچھلی بار جب ہم اگست کے مہینے میں یہاں آئے تھے تو اس میلے کی تیاریوں کو زور و شور سے ہوتا ہوا دیکھا تھا۔

وینس یورپ کا سب سے بڑا کارفری شہر ہے۔ یہاں کی نہریں اور پُل بہت مشہور ہیں اور ہر نہر اور پُل کا نام کسی نہ کسی مشہور فنکار اور نامور شخصیت کے نام پر رکھا گیا ہے۔ ایک سو اٹھارہ جزیروں پر مشتمل اس شہر کو ڈیڑھ سو سے زائد نہریں جدا کرتی ہیں۔ اِن میں سے کچھ جزیرے غیر آباد بھی ہیں مگر آباد جزیروں کو چار سو پلوں کے زریعے ملایا گیا ہے۔ پُرانے شہر میں یہ نہریں سڑکوں اور گلیوں کے استعمال میں آتی ہیں۔ یہاں ہر طرح کی آمدورفت پانی میں ہے۔ انیسویں صدی میں ریل گاڑی کے زریعے اس شہر کو ملا کر وینس ریلوے اسٹیشن قائم کیا گیا تھا۔ اور بعد میں شہر میں پارکنگ اور سڑکیں بنائی گئی تھیں۔ شہر کا بلدیاتی نظام چلانے میں بھی یہ واٹر کار اور بسیں بہترین معاون ہیں۔ جگہ جگہ سے کوڑا کرکٹ اُٹھانے والی واٹر لانچیں اپنے اپنے مخصوص مقام پر رُک کر کوڑا کرکٹ جمع کرنے کے لئے رُکتیں اور مخصوص رنگ وہیت کے لباس میں کام کرنے والے افراد نہایت مستعدی سے اپنے فرائض ادا کر کے آگے بڑھ جاتے۔ کچھ دیر بعد ایک پُل کے پاس ایک اٹالین پوسٹ آفس کی واٹر کار رُکی ہوئی دکھائی دی جس میں سے ڈاکیہ ایک بڑا ڈاک کا تھیلا لئے ڈاک بانٹنے کے لئے نکل رہا تھا۔ یہ سب کچھ میرے لئے بہت دلچسپ تھا۔ دو لاکھ پچھتر ہزار کی آبادی والے اس شہر کا سارا نظام پلوں اور کشتیوں پر دیکھ کر مجھے بہت مزا آرہا تھا۔ میری میزبان خاتون نے بتایا کہ اب اگلے اسٹاپ پر ہمیں اُترنا ہے وہ مجھے سین مارکو چرچ دکھانا چاہ رہی تھیں۔

چرچ تو ویسا ہی تھا جیسا عموماً ہوتا ہے۔ شہر کے بیچوں بیچ یہاں فرق صرف یہ تھا کہ یہ چرچ پانی کے بیچوں بیچ تھا۔ جسے چاروں طرف سے پل اور پانی کی سڑکیں ملا رہی تھیں۔ جس کے سامنے ایک بڑا کھلا علاقہ تھا جس میں بے شمار کبوتر لوگوں کے شوق اور نیکی کے عوض دانہ چگنے میں مصروف تھے اور اِن دانوں کی فروخت میں کچھ ضرورت مند اور کچھ ٹھگ بھی اپنے کمالات دکھا رہے تھے۔ سامنے ایک بڑے دروازے سے

لوگ اندر داخل ہو رہے تھے۔ میں نے میزبان خاتون سے کہا کہ اندر نہ جایا جائے کیونکہ وہاں کافی رش ہے ہمیں دیر ہو جائے گی۔ بس یہیں تھوڑی دیر رہ کر آگے بڑھتے ہیں۔ میری بات سنکر انہوں نے فوراً متفق ہوتے ہوئے سر ہلا کر حامی بھر لی۔ میرا مشورہ اتنی جلدی قبول ہو جائے گا میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہم چلتے چلتے ایک سوویئنر شاپ کی طرف آ گئے میں دلچسپی سے کچھ ویو کارڈ دیکھنے لگی تو فوراً ہی دکاندار عورت نے آگے بڑھ کر مذید کارڈ نکال کر دکھانا شروع کر دیئے اور ساتھ ہی ساتھ اٹالین میں اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اِن کی قیمتیں بتانے لگی۔ میں نے آگے بڑھنا چاہا تو قیمتیں کم کر کے آوازیں دینے لگی۔ مجھے ہنسی آ گئی میری میزبان نے میری جانب دیکھا تو میں نے اُن سے کہا کہ یہ دکانداری کا اسٹائیل تو کراچی کے زینب مارکیٹ والے دکان داروں والا ہے۔ وہاں بھی اگر غلطی سے کسی چیز کی قیمت دریافت کر لی تو اکثر وہ چیز خریدنی ہی پڑتی ہے۔ انہوں نے مسکرا کر کہا کہ یہاں بھی معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔ اگر تمہیں یہ خریدنا ہے تو اب تم اس کو اپنی مناسب قیمت بتاؤ اور اگر نہیں تو پھر اُن کے دام بہت گرا کر بتاؤ تا کہ بات نہ بنے کیونکہ اگر سودا پٹے گا تو یہ کارڈ تمہیں خریدنے پڑینگے۔ میں نے کچھ کارڈ اور کچھ چھوٹے موٹے سوویئنر کی ایک مناسب قیمت بتائی اور کچھ دیر کی تول مول کے بعد آخر کار میری پیش کردہ قیمت پر سودا پٹ گیا۔

وینس کے دو جزیرے مورانو اور بورانو بہت مشہور ہیں ان میں ایک جزیرہ کانچ اور شیشہ گری کے کاموں کی مہارت میں ثانی نہیں رکھتا۔ یورپ ہی نہیں دنیا بھر میں کانچ کی سجاوٹ کی اشیاء اور شیشے کے بڑے بڑے نمونے یہاں تیار کئے جاتے ہیں۔ اس خوبصورت جزیرے کا یہ نازک پن دیکھنے کے لئے ایک دن کی سیر بہت کم تھی اور یوں بھی اس جزیرے پر ہم گذشتہ ٹرپ میں سیر پر آ چکے تھے۔ اس کے علاوہ فنِ موسیقی کے حوالے سے یہاں بہت بڑے بڑے کنسرٹ منعقد کئے جاتے ہیں

کیونکہ یہی وہ شہر ہے جہاں سولہویں صدی عیسوی میں ایک مشہور موسیقار Adrian Willaert آدریان ولائرٹ نے دنیا کی بہترین موسیقی ترتیب دے کر موسیقی کی دنیا میں تحریر کا آغاز کیا اور میوزک نوٹ ترتیب دیئے تھے۔ یہاں فرانس اور دیگر علاقوں سے لوگ موسیقی کی تعلیم کے لئے آتے رہے ہیں۔ یہاں کلاسیکی موسیقی کے مخصوص ہال کے باہر آدریان ولائرٹ کا ایک بڑا مجسمہ بھی نصب ہے۔

پانی کے پاس میں ایک جگہ میں تصویر بنانے کے لئے کھڑی تھی کہ ایک گونڈولا کے ملاح نے انگریزی میں آواز لگا کر پوچھا کہ کیا اس میں ہمیں سیر کرنی ہے اس سے قبل میں کچھ کہتی میری میزبان خاتون نے اٹالین میں کچھ کہا اور ساتھی ملاح نے اپنی کشتی کنارے کے قریب لانا شروع کردی۔ میں نے میزبان خاتون سے کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ ایسی سجی سجائی روایتی کشتی کی سواری خاصی مہنگی ہوتی ہے بس اس کے ساتھ تصویریں بنا لیتے ہیں سیر کرنا ضروری نہیں ہے مگر انہوں نے کہا کہ وہ دام طے کر چکی ہیں بس یہاں سے آدھے گھنٹے کے بعد ہمیں یہ بس اسٹاپ کے قریب چھوڑ دیگا۔ اب ہم اس ڈولتی نیاء میں بیٹھنے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ کشتی چند منٹوں میں کنارے لگ گئی ایک نہایت خوبرو اطالوی نوجوان اس وقت ہمارا ناخدا تھا۔ مگر شکر ہے کہ کشتی بنا کسی طوفانی موجوں میں اُلجھے ہمیں کچھ دیر بعد ایک محفوظ اور دلکش مقام پر لے آئی۔

گونڈولا کشتی وینس کی روایتی کشتی ہے جو کہ صرف اندرونِ شہر چلتی ہے۔ کسی زمانے میں صرف یہی کشتی آمدورفت کا واحد ذریعہ تھی مگر آج کل موٹر کا دور ہے زیادہ تر لوگ واٹر بس اور ٹیکسی ہی استعمال کرتے ہیں۔ یہ گونڈولا کشتیاں صرف سیاحت، شادی بیاہ اور دیگر روایتی تقاریب کے لئے استعمال ہوتی ہیں۔ جن کے چلانے والے ملاح بھی خاص روایتی لباس میں کھڑے ہو کر ان کے خصوصی چپو چلاتے ہوئے دلکش منظر پیش کرتے ہیں۔

کچھ دیر گنڈولا میں سیر کر کے ہم ایک خوبصورت ریستوراں کے پاس اُتر

گئے۔ سورج اپنی واپسی کی تیاری کر رہا تھا اب ہم بھی واپسی کا منصوبہ بناتے ہوئے بس اسٹاپ کی جانب چلنے لگے۔ سارا دن گھومتے پھرتے آئس کریم اور پیزا کھاتے اور اٹلی کی خاص کپا چینو کافی پیتے ہمیں وقت کے گذرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ بس اسٹاپ پر سیاحوں کی واپسی کا رش لگا ہوا تھا کچھ لوگ سوٹ کیس اور بڑے بڑے بیگ سنبھالے آنے والی واٹر بس کے منتظر تھے۔ یہاں سے ایک واٹر بس صرف سات منٹ میں مارکو پولو ائر پورٹ پہنچاتی ہے۔ یہ ہوائی اڈا خشکی پر شمالی جانب اٹلی کی مشہور شخصیت مارکو پولو کے نام پر تعمیر کیا گیا ہے۔ ہمیں صرف ایک اسٹاپ آگے جانا تھا لہٰذا کھڑے کھڑے ہی سفر طے کر لیا۔ اسٹاپ پر اُترنے کے بعد اور چند پلوں کو پار کرنے کے بعد ہم اپنی گاڑی کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ڈرائیور نے بڑھ کر دروازہ کھولا تو ہم تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں سورج کی سنہری کرنیں ہمیں وینس کی جانب سے الوداع کرنے لگیں اور ہم وریسے کی جانب بڑھنے لگے۔ ابھی گاڑی دس منٹ ہی چلی ہوگی کہ عمران کا فون آ گیا کہ وہ اور لبنیٰ آج رات کی میزبانی کے لئے تیار ہیں۔

عمران کی مہمان نوازی

برلن میں میری ملاقات عمران سے بہت زیادہ نہیں تھی وہ رفیق کا دوست تھا اور رفیق میرے لئے بالکل میرے سگے بھائیوں جیسا تھا۔ اُس کے امریکہ جانے کے بعد سے مجھے اُس کی کمی بہت محسوس ہوتی تھی۔ انور اور بچے بھی اُسے خاصہ مس کرتے تھے۔ اب بھائی کے دوست کے یہاں جانا اور وہ بھی جا کر رات رُک جانا مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ بہر حال وینس سے واپسی پر میں خاصی تھک گئی تھی دل چاہ رہا تھا کہ بستر پر جا کر صبح ہی اُٹھوں۔ مگر اب جانا بھی ضروری تھا کیونکہ آنے کا وعدہ جو کر لیا تھا۔ گھر آ کر نہا دھو کر تیار ہوئی اور رات رکنے کے لئے سلیپنگ سوٹ بھی ساتھ رکھ لیا۔ نیند سخت آ رہی تھی نیچے باورچی خانے میں جا کر چائے بنائی اور کپ لیکر سامنے بالکونی میں کھڑی ہو کر آنے جانے والی گاڑیوں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ رات کے آٹھ بجنے والے تھے۔ سڑکوں پہ گاڑیوں کی تعداد میں کمی ہو رہی تھی۔ ہر آنے والی گاڑی پہ گمان ہوتا کہ یہ عمران کی گاڑی ہے۔ آدھا گھنٹہ یونہی گزر گیا۔ عمران کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ میں نے فون ملایا تو فون بھی بیزی جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اُس کا خود ہی فون آ گیا کہ میں یہاں قریب ہی منڈلا رہا ہوں مگر مکان نہیں مل رہا۔ اور جو مکان نمبر آپ

نے مجھے دیا تھا اس نام اور نمبر کی تو پوری سڑک ہے میں آپ کی رہائش گاہ کہاں تلاش کروں ۔ میں نے اُس سے کہا کہ تم اُس سڑک پہ دوبارہ آؤ میں گھر سے باہر آتی ہوں ۔ پھر میں سامان سمیٹ کر اور اپنی میزبان خاتون کو فون پر بتا کر گھر سے باہر چلی گئی ۔ یہ ایک ڈھلوانی علاقہ تھا۔ عمران ایک جانب گاڑی پارک کر کے پیدل مجھے تلاش کر رہا تھا۔ مجھے ملکر وہ بہت خوش ہوا اُس کی خوشی اُسکی آنکھوں اور باتوں سے ٹپک رہی تھی ۔ پھر ہم اُسکی گاڑی کی جانب گئے ۔ گاڑی میں اُسکی بیوی لبنیٰ اور دو سالہ بیٹا ضورس بیٹھے ہوئے تھے۔ لبنیٰ نے بڑھ کر میرا خیر مقدم کیا ضورس میاں اپنی گول گول آنکھوں میں حیرت بھرے مجھے تکتے رہے۔ عمران حیرت زدہ تھا کہ میرا قیام اس محل میں ہے جو باہر سے بھوت محل دیکھائی دیتا ہے۔ وہ اس کو اب تک کوئی سرکاری یا تاریخی عمارت سمجھ کر یہاں سے آگے بڑھ جا رہا تھا اور یوں بھی اس کا پتہ بھی کچھ عجیب ہی لگ رہا تھا۔ بہر حال کچھ دیر بعد عمران نے کار اسٹارٹ کی اور اپنے گھر کی جانب بڑھ گیا۔ عمران میلان کے قریبی علاقے گرالا تھے میں رہائش پزیر تھا جو کہ مال پنزا ائیر پورٹ سے دس بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ میں اسی ائیر پورٹ سے میلان آئی تھی ۔

گھر پہنچتے ہی لبنیٰ نے چائے بنائی اور رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف ہو گئی ۔ میں کچن کے سامنے پڑے صوفے پر ہی بیٹھ کر اُس سے بات چیت میں مصروف ہو گئی ۔ عمران نے انٹرنیٹ آن کر کے سب سے پہلے میری انور سے بات کروائی اور پھر رفیق سے ۔ ضورس میاں اپنے کھلونے لا لا کر دکھانے لگے ۔ بہت پیارا بیٹا ہے تمہارا۔۔۔ میں نے عمران سے کہا تو روٹی پکاتی ہوئی لبنیٰ نے ٹکڑا لگایا کہ ''بہت شرارتی بھی ہے''۔ مگر بچوں سے اُن کی شرارت دور کر دی جائے تو وہ بچے کب رہتے ہیں ہاں البتہ اگر بڑے شرارت کرنے لگیں تو مسئلہ غور طلب ہے۔ میں نے جواباً کہا۔ لبنیٰ نے زور کا قہقہہ لگایا اور کہا ارے یہ تو بالکل کراچی کے لوگوں والی ذو معنی بات کر دی آپ نے ۔ ہم تو یہاں ترس گئے ہیں انٹلیکچوئل باتیں کرنے اور سننے کو۔ میں

نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ عمران تم تو برلن میں خاصے انٹلیکچوئل ہوا کرتے تھے۔ یہ لبنیٰ کیا کہہ رہی ہے اور پھر ہم تینوں زور سے ہنس پڑے تو ننھے ضورس نے بھی اُچھل اُچھل کر اپنی خوشی کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔

میں نے تھوڑی دیر بعد گھر کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ عمران کے گھر میں سونے کا صرف ایک ہی کمرہ تھا اور باورچی خانے کے سامنے جو صوفہ رکھا تھا مجھے رات اُس پر ہی گزارنی ہے۔ رات دیر تک ہم لوگ باتیں کرتے رہے محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ لبنیٰ سے یہ میری پہلی ملاقات ہے۔ رات ہی یہ پلان بنا کہ ہم صبح میلان کی سیر کو چلیں گے کیونکہ میں نے یونیورسٹی آتے جاتے ہی شہر کے کچھ مخصوص حصے دیکھے تھے اب عمران مجھے تفصیلی طور پر میلان کی خاص خاص جگہیں دکھانا چاہ رہا تھا۔ میں اُس کی اس پُرخلوص پیشکش سے بہت متاثر ہوئی۔ جب سونے کا وقت آیا تو لبنیٰ اور عمران اپنے پڑوسی کے ساتھ ملکر ایک بڑا میٹرس اپنے فلیٹ کے اجتماعی اسٹور روم سے لیکر آ گئے۔ جس پر تکیے ڈال کر دونوں میاں بیوی خود سونے کی تیاری کرنے لگے اور مجھے زبردستی اپنا کمرہ اور بستر سونے کے لئے دے دیا۔ اُن کی یہ اپنائیت اور مہمان نوازی میرے لئے کسی احسان سے کم نہ تھی۔ نیند تو مجھے رات کو ٹھیک سے نہیں آئی۔ لیکن تحفظ اور اپنائیت کا احساس پا کر بہت اچھا لگا۔ ضورس سے ملکر سارہ اور مایا بھی بہت یاد آنے لگیں تھیں۔

اگلے روز ہم عمران کی کار میں سوار ہو کر اسٹشن تک آئے اور ریل کے ٹکٹ لے کر میلان کے لئے روانہ ہو گئے۔ میلان پہنچ کر سب سے پہلے میلان کا قدیم ترین تاریخی گرجا گھر جو ''ڈومو'' کہلاتا ہے وہ دیکھنے گئے۔ اسٹیشن سے باہر آتے ہی کچھ میٹر کے فاصلے پر یہ عبادت گاہ تھی۔ اتوار کا دن ہونے کی وجہ سے بہت لوگ اپنے اپنے خاندانوں سمیت عبادت کے لئے بھی وہاں روانہ ہو رہے تھے۔ یہ گرجا گھر '' ڈوموڈی میلانو'' کے نام سے دنیا کے مشہور گرجا گھروں شمار کیا جاتا ہے۔

یہاں کی خاص بات جو اسے دنیا کے بڑے گرجا گھروں ممتاز کرتی ہے وہ اس کی غیر معمولی طرزِ تعمیر ہے۔ یہ آرک بشپ کی نشست بھی ہے اور عیسائی طریقہء عبادات کی روایات سے وابستہ ایک عظیم مذہبی عبادت گاہ بھی ہے۔ یہ ڈوم ۱۳۸۸ء سے ۱۹۶۵ء تک گاہے بگاہے تعمیر کیا جاتا رہا۔ اس عمارت اور اُسکے احاطے کا کل رقبہ گیارہ ہزار مربع میٹر سے زیادہ ہے جبکہ اس عمارت کی لمبائی ایک سو چھ اعشاریہ پانچ میٹر بلند ہے۔ رقبے کے لحاظ سے یہ دنیا کا تیسرا بڑا چرچ ہے۔ یہ ساری معلومات عمارت کے آہنی دروازے کے باہر لگی تختی پہ موجود تھی۔ ہلکی رنگت کی سنگِ مرمر کی دیواریں نہایت دیدہ زیب تھیں اور عمارت کا صدر دروازہ اپنی ساخت اور نقش ونگار کے حوالے سے تمام سیاحوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائے ہوئے تھا۔ گرجا گھر کے سامنے کھلے احاطے میں بہت سارے لوگ کبوتروں کو دانہ ڈال رہے تھے۔ ننھے ضورس نے اپنے پرام سے نکل کر اس کارِ خیر میں حصہ لینے کی بہت کوشش کی مگر لبنیٰ نے بے چارے کو زبردستی اسکے پرام میں مذید کس کر باندھ دیا اور قطار میں کھڑی ہوگئی۔ میرے ساتھ ساتھ اٹلی کا تاریخی شہر میلان دیکھنے والے دوسرے سیاح بھی اس عمارت کے معماروں کی کارگری پر حیران ہو رہے تھے انتہائی بلند قامت عمارت کا صدر دروازہ ہی نفاست اور فن کی فنی کاری گری اور مہارت کا ثبوت پیش کر رہا تھا کہ ہر دیدہء بینا نے اندر داخل ہونے سے قبل ہی اندرونی عمارت میں فن وثقافت کے چھپے خزانوں کا اندازہ لگا لیا تھا۔ ہم قطار بنا کر آہستہ آہستہ گرجا گھر میں داخل ہوگئے۔ ایک عجیب روحانی سا منظر تھا۔ سامنے ہی دیوار پر حضرت عیسیٰؑ کا بڑا سا مجسمہ لگا ہوا تھا اور نیچے بڑے سے تخت نما حصے پر بی بی مریم علیہا السلام کا مجسمہ بھی آویزاں تھا۔ بڑی بڑی اُونچی کھڑکیوں کے شیشوں کو مختلف رنگوں سے سجا کر مذید رنگین بنا دیا گیا تھا اور اس ہلکے اندھیرے کمرے میں لوگ موم بتیاں جلا کر ماحول کو عجیب سحر انگیز بنا رہے تھے۔ چرچ کے اس لمبے چوڑے ہال کو داخلی حصے میں ہی تاریخی تصویریں لگا کر دو حصوں میں

بانٹ دیا گیا تھا جس کے ایک طرف سے لوگ اندر داخل ہو رہے تھے اور مختلف حصوں میں بٹتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ جو لوگ عبادت کے لئے آئے تھے وہ عبادت کے حصے کی جانب جا رہے تھے اور جو سیاح تھے وہ تصویروں کے ساتھ چلتے چلتے مذید فنی شاہکار مجسمے، تاریخی دستاویزات، تصاویر، ساز و سامان اور اندرونی آرائش و زیبائش کا جائزہ لیتے ہوئے باہر کی جانب نکل رہے تھے۔ چرچ کے اندر چار سو سے زائد مجسمات رکھے ہوئے ہیں جن کی تصویریں بنانے کی کوئی ممانعت نہیں تھی مگر پھر بھی لوگوں کو انتباہ کیا جا رہا تھا کہ عبادت میں خلل نہ پڑے لہٰذا فلش لائیٹ ڈالتے وقت خیال رکھا جائے اور شور و غُل سے اجتناب کیا جائے۔ لبنیٰ کے لئے اس ماحول میں ضورس میاں کو سنبھالنا خاصہ مشکل کام تھا۔ وہ ضورس کے ساتھ ملکر موم بتیوں کے اسٹینڈ کے پاس کھڑی ہوگئی اور موم بتی جلانے لگی۔ میں نے اپنے موبائیل فون کے کیمرے سے کچھ تصاویر اُتاریں اور ہم آہستہ آہستہ باہر نکل آئے۔ ابکی بار باہر نکلتے ہی ضورس میاں خود پہ قابو نہ پا سکے اور لگے کبوتروں کے پیچھے دوڑنے ۔ چرچ کے اندر اتنے صبر کا مظاہرہ کرنے کے بعد اُن کا اتنا حق تو بنتا تھا کہ اب چرچ کے سامنے کھلے علاقے میں تھوڑا کھیل کود سکیں۔ چرچ کے سامنے کا یہ کھلا علاقہ پیاسا دیل ڈومو Piazza del Dumomo ہے۔ میں اکثر یونیورسٹی سے آتے جاتے اس چوک پر لوگوں کا ایک ہجوم دیکھا کرتی تھی پر آج یہ ہجوم کچھ زیادہ ہی تھا۔ شاید وجہ یہ تھی کہ دکانیں کھلی ہوئی تھیں اور شوقیہ اور سیاحوں کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگ بھی خریداری کی غرض سے یہاں کے بڑے شاپنگ سینٹر آ رہے تھے اس شاپنگ مال میں اٹلی کے مشہور و معروف ڈیزائینرز اور فنکاروں کے فن پارے نہایت مہنگے داموں دستیاب تھے۔ خوشبوؤں اور رنگوں سے سجا یہ طویل شاپنگ مال اپنے گاہکوں اور سیاحوں کو خوش آمدید کہہ رہا تھا۔

میں ایک ڈیزائنر ہنڈ بیگز کی دکان میں لبنیٰ کے ساتھ چلی گئی۔ اپنی بیٹی سارہ

اور بہن ثروت کے لئے ایک ایک بیگ خریدے۔اس کے بعد کچھ اور خریدنے کی ہمت نہ ہوئی۔ بچوں کے کپڑوں کی دکان کی کھڑکیاں ایسٹر کے تہوار کے فیشن سے نہایت خوبصورتی سے سجی ہوئی تھیں۔ میں رُک کر دیکھنے لگی۔ ''بچوں کے سامان یہاں بہت اچھے اور مناسب قیمت میں مل جاتے ہیں'' لبنیٰ نے شاید میرے چہرے کو پڑھتے ہوئے کہا۔ میری چھوٹی بیٹی مایا نے فرمائش کی تھی کہ میں اُسکے لئے شہزادیوں والے جوتے اور ڈریس لیکر آؤں اور ساتھ ساتھ لپ گلوس اور بالوں کے کلپ اور پونی بھی۔عمران نے پیشکش کی کہ وہ اور ضورس میکڈونلڈ میں بیٹھ جاتے ہیں میں اور لبنیٰ شاپنگ کر کے آجائیں۔اتنی اچھی پیشکش ملنے پر میں مایا کی کچھ فرمائشیں بھی پوری کرنے کے لئے لبنیٰ کے ساتھ چلدی۔

اب ہم تھک گئے تھے۔ کچھ اور خاص مقامات دیکھتے ہوئے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگئے۔میلان سے گرالا تھے پہنچتے ہی میں نے اپنی میزبان کو فون کیا اور بتایا کہ میں رات دس بجے تک آجاؤنگی۔اس کے بعد لبنیٰ نے بہت لذیذ بریانی بنائی جس کی تعریف میں اس بار بھی عمران نے ''ٹائٹ'' کہا اور ساتھ ہی اگلے دن کے لئے ایک ڈبہ میرے ساتھ کر دیا۔رات نو بجے کے قریب یہ تینوں ملکر مجھے میری رہائش گاہ پر چھوڑ آئے اور ساتھ ہی وعدہ کیا کہ برلن میں جلد مُلاقات ہوگی۔

عمران اور لبنیٰ کے خلوص نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ پردیس میں گھر سے دور رہنے والے اکیلے افراد اپنے گھر اور گھر والوں کے لئے کیسی تڑپ رکھتے ہیں اس کا اندازہ آج مجھے اُس وقت بخوبی ہو رہا تھا جب میں عمران کے خاندان سے ملی اور بعد میں اُن کو چھوڑ کر اپنی رہائش گاہ کے باہر سے اُس وقت تک ہاتھ ہلاتی رہی جب تک کہ اُن کی گاڑی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوگئی۔

اگلے ہفتے کے آخر میں مجھے واپس لوٹنا تھا زندگی کے نئے تجربوں، مثبت ارادوں اور نئی توانائیوں کے ساتھ،اور میں محسوس کر رہی تھی کہ اچھا ویک اینڈ گزارنے

کے بعد دل و دماغ کافی پُرسکون تھا اور آج تو میرے بھوت بنگلے کی لائیٹیں بھی غیر معمولی طور پر اچھی خاصی روشن تھیں۔ شاید میری میزبان خاتون کے بچے اور شوہر سردیوں کی چھٹیاں منا کر واپس لوٹ آئے تھے۔

ایک واقعہ

میرے لئے پیر یا سوموار کے دن کا آغاز ہمیشہ ہفتے بھر کی ذمہ داریوں کا احساس لئے یا گزرے ویک اینڈ کی سستی لئے عجیب تھکا تھکا سا ہوتا ہے۔ کام پہ بس جمائی پہ جمائی آتی رہتی ہے۔ دل بار بار تکیہ اور بستر کو یاد کرتا ہے اور نظر بار بار گھڑی کی طرف جاتی رہتی ہے۔ مگر آج ایسا بالکل نہیں تھا۔ میں صبح صبح نہا دھو کر جب کام کے لئے نکلی تو ایک خوشگوار تازگی اور کام کی لگن اور جہت کا احساس میرے ساتھ تھا۔ بس گھڑی کے بجائے آج کل نظریں کیلنڈر کی طرف زیادہ اُٹھتی تھیں۔ مجھے یہاں آئے ایک ہفتے سے زیادہ ہو چلا تھا۔ ایک ڈیڑھ ہفتے میں واپسی کا وقت طے تھا۔ تدریس کے ساتھ ساتھ یہاں تحقیق و مباحثہ کا سلسلہ بھی جاری تھا اور روزانہ شام کو اپنی میزبان کی اُردو کی پرائیوٹ کلاس کا بھی۔ وہ اُردو زبان و گرامر اور اُس کے لفظ و معنی کو رومن لکھائی میں سیکھ رہی تھیں۔ اُن کا کہنا تھا کہ انہیں یہ زبان صرف بولنے کے لئے سیکھنی ہے لکھنے کے لئے نہیں۔ زبان کے ارتقاء سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اُردو زبان کے حروفِ تہجی اُن کے لئے خاصے مشکل تھے۔ بالخصوص ع، غ ٹ، ٹھ، تھ، کھ، ڈھ، دھ، بھ، پھ، خ، اور ق سے نکلے الفاظ کی آواز نکالنے اور تلفظ ادا کرنے میں اُنہیں خاصی پریشانی تھی۔ اس کے برعکس ت، د، اور چ سے نکلنے والی آواز اور الفاظ

بغیر کسی اضافی مشق کے نہایت مستعدی سے ادا کر دیتی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب انڈیالوجی ڈپارٹمنٹ کے پروفیسر نسپٹال میرے ساتھ اپنی زبانی اُردو کی مشق کیا کرتے تھے تو ٹھنڈا پانی کو ہمیشہ ٹنڈا پانی، پڑھائی کو پرائی اور میز کو میس ہی کہا کرتے تھے جس پر اکثر میری ہنسی نکل جایا کرتی تھی جسے میں بڑی مشکل سے برداشت کرتی تھی مگر میرے تمام ہی جرمن طالبِ علم ق، خ، اور غ کا تلفظ نہایت اچھا ادا کرتے ہیں کیونکہ جرمن زبان میں بھی اس آواز والے الفاظ موجود ہیں۔ کبھی کبھی الفاظ ادا کرنے کی مشق کے دوران مجھے محسوس ہوتا کہ میری میزبان خاتون نے اپنی ساری توجہ اور دلچسپی اُردو کی طرف مرکوز کی ہوئی ہے۔ وہ نہایت دلجمعی کے ساتھ اُردو گرامر کی بھی مشق کرتی تھیں۔ وہ ان ڈیڑھ دو ہفتوں میں خاصی اُردو سیکھ گئی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ میں نے اُن کو ابتدائی اُردو گرامر بہت اچھے طریقے سے سمجھائی ہے۔ اُن کے ساتھ کچھ دیر اُردو میں بات چیت کر کے مجھے بھی بہت خوشی ہوتی تھی۔ یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس بھی میری کارکردگی سے بہت خوش تھے۔ ہر طرف سے مثبت ردِعمل سامنے آ رہا تھا۔ مجھے بھی اپنی محنت اور لگن پہ فخر ہونے لگا تھا۔ میں بہتر سے بہتر طریقہ کار اپنا کر اور پوری دلچسپی اور توجہ سے اپنا کام انجام دے رہی تھی۔

اُس روز مجھے یورپی ادب کی تاریخ کے حوالے سے کچھ کتابوں کی ضرورت تھی۔ میری میزبان کے گھر میں ہر قسم کے موضوعات پر کتابیں موجود تھیں جس کا انکشاف انہوں نے ایک دن اُردو کی کلاس کے دوران کیا۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ اُن کے مہمان خانے کی عمارت کے تہہ خانے میں ایک بڑا ہال ہے جو مختلف موضوعات کی پُرانی کتابوں سے بھرا ہوا ہے۔ جس میں اطالوی زبان کے ساتھ ساتھ انگریزی، جرمن اور فرنچ زبان میں بے شمار کتابیں موجود ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں چاہوں تو وہاں سے کچھ کتابیں اپنے ساتھ برلن بھی لے جا سکتی ہوں۔ اس کے علاوہ بھی میں اُن کے مہمان خانے اور گھر کے دیگر حصوں میں کتابوں کے دیوقامت شیلف دیکھ چکی

تھی۔جس میں مختلف موضوعات پر اور مختلف زبانوں میں کتابیں آراستہ تھیں۔انہوں نے بتایا تھا کہ اُن کے شوہر مطالعے کے شوقین ہیں۔تاریخ، جغرافیہ اور سماجیات اُن کے خاص موضوعات ہیں اور ان ہی موضوعات کے حوالے سے اُن کا تعلق اُسی مذکورہ یونیورسٹی کے شعبے انتھراپالوجی یعنی علم انسانیات سے ہے جس میں آج کل میں یہ کانفرنس اور سیمنار اٹینڈ کر رہی ہوں۔

میری ملاقات ابھی تک اُن کے شوہر اور بچوں سے نہیں ہوئی تھی۔آج رات کے کھانے پر گھر کے تمام افراد اور ملازمین سے تعارف ہونا تھا۔

میں خاصی متجسس تھی۔شام سات بجے تیار ہو کر اُن کے رہائشی حصے کی جانب چل دی۔ بلیاں حسبِ معمول میرے آگے آگے چل کر رہنمائی کر رہی تھیں۔ اندھیرے میں جنگل نما باغ کے درمیان سے گزرتے ہوئے یہ بلیاں مجھے خاصی کھٹک رہی تھیں۔بہر حال میں جب وہاں کے صدر دروازے پر پہنچی تو ایک ملازمہ نے دروازہ کھول کر مجھے خوش آمدید کہا۔یہ ملازمہ بھی میرے لئے اُس روز ایک نیا چہرہ تھی وہ سیاہ بالوں والی ایک ایشیائی عورت لگ رہی تھی۔میں نے مسکرا کر سلام کیا۔وہ مجھے کھانے کے لئے باورچی خانے سے ملحق ایک کھانے کے کمرے میں لیکر گئی اور انگریزی میں مہمان کی کرسی پر بیٹھنے کی درخواست کی۔یہ ایک دوسرا کھانے کا کمرہ تھا۔ پرانی طرز کی کرسیوں پر سرخ غلاف چڑھے ہوئے تھے اور ایک انتہائی قدیم میز کو کڑھائی والے میز پوش سے ڈھانپ کر یا تو سجایا گیا تھا یا قدامت مٹانے کی کوشش کی گئی تھی۔سبزی کے سوپ کے پیالے میز پر رکھے تھے اور ساتھ ہی سیاہ اور سبز زیتون چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں دو تین جگہ رکھے تھے۔سفید اٹالین چیاباتا بریڈ بھی بید کی ٹوکری میں قرینے سے سجی ہوئی تھیں۔میں ابھی کمرے کا جائزہ لے ہی رہی تھی کہ میں چند منٹ کے بعد بچوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔پندرہ سے آٹھ نو سال کی عمر کے پانچ بچے اپنی اپنی خاص نشستوں پر بیٹھ کر نہایت متجسس نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے

تھے۔ یہ بچے اپنی رنگت اور نقوش کے حساب سے کہیں سے بھی حقیقی بہن بھائی نہیں دکھائی دے رہے تھے بلکہ دنیا کے مختلف ملکوں اور براعظموں سے اُن کا تعلق عیاں ہو رہا تھا۔ سب سے چھوٹے دونوں بچوں کی عمریں بھی ایک ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ ابھی بغیر الفاظ کے ہم لوگ ایک دوسرے کو جاننے کی کوشش کر ہی رہے تھے کہ گھر کے سربراہان یعنی میری میزبان اور اُن کے شوہرِ نامدار پُر جوش انداز میں سلام کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ میری میزبان نے اپنے شوہر کا مختصر تعارف کروایا اور میرے بارے میں تفصیلاً اطلاعات فراہم کیں جس کے بعد انہوں نے نہایت گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ ملا کر باری باری بچوں کے نام کے ساتھ اُن کا تعارف کروایا۔ انہوں نے بتایا کہ اُن کے دو بچے یونی ورسٹی کے طالبِ علم ہیں۔ بڑی بیٹی سوئیزرلینڈ میں سماجیات کی تعلیم حاصل کر رہی ہے اور ایک بیٹا میڈیا ٹیکنالوجی میں انجینئرنگ کے پہلے سمسٹر میں ہے۔ مجھے سب سے ملکر بہت خوشی ہوئی۔ اب آہستہ آہستہ یہاں اپنائیت کا احساس ہونے لگا تھا۔

رات کے کھانے کے بعد ہم نے کچھ دیر اردو کی مشق کی۔ اس دوران بچے اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ میری میزبان نے بتایا کہ صرف سوئیزرلینڈ میں پڑھنے والے دو بچے اور ایک پندرہ سالہ لڑکی اُن کے اپنے ہیں اور بقیہ یہ چاروں بچے لے پالک ہیں جو کہ ایشیاء، افریقہ اور مشرقی یورپ کے غریب گھرانوں سے انہوں نے ایڈوپٹ کئے ہیں۔ مگر یہ بچے اُنہیں اُن کے حقیقی بچوں سے کسی بھی طور کم عزیز نہیں ہیں۔ آج میں اس خاندان کی فراخدلی اور انسان دوستی کی دل سے قائل ہوگئی تھی۔

اگلے دن میں گھر جلدی آگئی تھی۔ بچے بھی اُس ہی وقت اسکول سے آئے تھے، گھر میں ایک شور تھا۔ آج شام میں پڑھانا بھی تھا اور بعد میں تہہ خانے کی لائبریری کا جائزہ لینا بھی میرے آج کے پروگرام میں شامل تھا۔ اور انور اور بچوں سے بھی تفصیل سے بات چیت کرنا تھی۔ میری میزبان خاتون محل کے احاطے میں بچوں کو

گاڑی سے اُتر وارہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگیں کہ آدھے گھنٹے بعد میں اُن کی جانب دوپہر کے کھانے کے لئے آجاؤں تا کہ آج کھانے کے بعد ہی وہ اُردو کی کلاس لے سکیں۔ شاید وہ آج شام کو کہیں باہر جارہی تھیں۔ اب یہ حکم تھا یا درخواست۔ میں اتنی جلدی فیصلہ نہ کر پائی اور اثبات میں سر ہلا کر آمادگی کا اظہار کر دیا۔

بہر حال آدھے گھنٹے بعد نوڈل اور سبزی جو بہت لذیذ سوس کے ساتھ بیک کئے ہوئے تھے، کھانے کے لئے پیش کئے گئے میں نے تو سیر ہو کر کھانا کھایا مگر بچے سبزی سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے مگر ایک خادمہ اُن کو مسلسل اصرار کے ساتھ سوئٹ ڈش کا لالچ دلاتے ہوئے ان کو سبزی خوری پر مجبور کر رہی تھی۔ مجھے سارہ یاد آ گئی۔ سبزی تو کیا اُس کو گوشت بھی کھلانا مشکل کام ہوتا تھا۔ ابھی تک صرف پیزا اور نوڈل ہی اُسکی مرغوب غذا ہیں۔ دیسی کھانے بڑی مشکل سے اُس کو کھلانے پڑتے تھے۔ بچپن میں انور اور میں اُس کو آئسکریم اور چاکلیٹ کا لالچ دلا کر سبزی کھلایا کرتے تھے۔ مگر اب تو وہ چودہ سال کی ہونے والی ہے اور اب خود ہی تجربے کرتی ہے اور کچھ نہ کچھ پکاتی رہتی ہے۔ آج کل ویسے بھی مکمل سبزی خور بنی ہوئی ہے۔ ایک دم سے مجھے سارہ مایا کی یاد نے رنجیدہ کر دیا۔ اچانک نوالے حلق میں پھنسنے لگے۔ سب سے چھوٹے والے بچے نے جلدی سے مجھے پانی کی پیشکش کی۔ میں پھر واپس یادوں کی دنیا سے لوٹ آئی۔ کھانا کھا کر بچے اپنی اپنی پلیٹیں لیکر باورچی خانے کی جانب چل دیے ایک ملازمہ میز صاف کرنے لگی اِن ملازموں کو میں نے اپنی رہائش گاہ کے حصے میں کبھی نہیں دیکھا تھا بہر حال وہی ملازمہ کچھ دیر بعد چائے لیکر آ گئی اور وہیں میز پر میں اپنی میزبان خاتون کی ٹوٹی پھوٹی اردو جملوں کی مشق میں میٹھی میٹھی باتوں کے مزے چائے کے ساتھ لینے لگی۔

کچھ دیر بعد جب باہر نکلی تو سارے بچے باغ میں کھیل رہے تھے۔ میں وہیں رُک کر اُن کو دیکھنے لگی۔ میرے یوں رُک کر دیکھنے پر چند ہی منٹ میں دونوں آٹھ اور

نو سالہ بچے میرے پاس آ گئے ۔ میں بچوں کے ساتھ باہر باغ میں تھوڑی دیر بات چیت کرتی رہی ۔ وہ میرے بارے میں بہت متجسس تھے ۔ پاکستان کا نام اُن کے لئے ایک غریب بچوں اور اُن کے مسائل سے بھرے ہوئے ملک کا نام تھا جہاں اچھا کھانا، تعلیم و تربیت، کپڑے علاج اور حتیٰ کہ صاف پانی کا حصول بھی کسی عیاشی سے کم نہ تھا۔ اُن کو غربت اور اس سے جنم لینے والے مسائیل کے بارے میں مکمل معلومات تھیں اور ان کو اس بات پر پورا یقین تھا کہ صحت اور تعلیم ہی کے ذریعے اِن مسائیل سے جان چھڑائی جا سکتی ہے اور اچھی صحت اور بہتر تعلیم ہر بچے کا بنیادی حق ہے اور ہر بڑے کا فرض ہے کہ وہ بچوں کے اِن حقوق کی ادائیگی میں اپنا کردار ادا کریں ۔ ان بڑے لوگوں میں والدین، خاندان، سرپرست، محلّہ، معاشرہ، حکومت اور ہر صاحبِ حیثیت شہری سمیت سب ہی افراد شامل ہیں ۔ میں اُن کے ساتھ بات چیت کر کے بہت خوشی محسوس کر رہی تھی کہ اچانک اُن میں سب سے چھوٹے گندمی رنگت اور بھورے بالوں والے لڑکے نے ایسے ایسے سوال کر ڈالے جس کے جواب میں میں اچھی خاصی شرمندہ ہو گئی ۔ اُس نے مجھ سے بلا جھجھک پوچھا کہ کیا آپ اپنے ملک کے کسی ایسے غریب بچے کے لئے تعلیم اور صحت کے معاملے میں معاون رہی ہیں؟ ابھی میں جواب سوچ ہی رہی تھی کہ دوسرا سوال آ گیا ۔۔۔ کیا آپ نے اُن بچوں کو قریب سے دیکھا ہے جن پر بچپن ہی سے گھر بار چلانے کی ذمہ داری پڑ جاتی ہے اور اُن کو اسکول چھوڑنا پڑتا ہے؟ اپنے حق سے محروم ہونا پڑتا ہے آپ کا شمار تو عمر، پیسہ، تعلیم ہر لحاظ سے بڑے لوگوں میں ہوتا ہے کیا آپ نے کبھی اپنا فرض ادا کرتے ہوئے اُن بے چارے غریب بچوں کے لئے کچھ کیا ہے؟؟ وہ میری جانب آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مجھ سے براہِ راست مخاطب تھا ۔ مجھ پر گھڑوں پانی پھر گیا ،اس وقت مجھے لگ رہا تھا کہ جب میں بحیثیت صحافی کسی غاصب یا اپنے ملکوں سے آئے سیاست اور حکومت کے ٹھیکے داروں سے ملکی اور عوام کے حقوق پر بات چیت

کرتی ہوں تو احتجاجاً جرح کے طور پر جواب سنے بغیر ہی سوال پہ سوال کئے جاتی ہوں ۔ مجھے لگا کہ اب کی بار تھپڑ گھوم کر میرے منہہ پر پڑا ہے۔ اپنا فرض ادا کئے بغیر دوسروں کو اُنکے فرائض یاد دلانا ہم صحافیوں کی شاید عام بیماری ہے۔ میں نے ندامت کے ساتھ ''نہیں'' کہتے ہوئے سر ہلا دیا اور سوری کہہ کر بہانہ بنایا کہ مجھے ابھی بہت سارا کام کرنا ہے اس لئے کسی اور دن تفصیل سے بات کریں گے۔ میں بڑے بھاری قدموں کے ساتھ اپنی عارضی آماجگاہ کی جانب جا رہی تھی۔ میرا ضمیر مجھے بہت ملامت کر رہا تھا اور شرمندگی کا احساس رگ و پے میں اُترتا محسوس ہو رہا تھا۔

اپنے کمرے میں آ کر تھوڑی دیر بستر پر ہی لیٹی رہی۔ اپنا ملک وہاں کے نظام، حکمران اور عوام کے مسائیل کے بارے میں سوچتے ہوئے غصہ، ندامت اور تاسف کے ملے جلے جذبات تھے جن سے خیالوں ہی خیالوں میں نمٹتے ہوئے جانے کب آنکھ لگ گئی۔ موبائیل فون کی گھنٹی بجنے پر آنکھ کھلی تو اچھی خاصی شام ہو چلی تھی۔ فون پر مایا رو رہی تھی۔ اسکول کے ہوم ورک میں کچھ مسئلہ تھا اور سارہ اُسکی مدد نہیں کر رہی تھی کیونکہ وہ بھی اپنا ہوم روک کرنے میں مصروف تھی۔ پاپا کہاں چلے گئے؟؟ میں نے مایا سے پوچھا۔ ''وہ بریڈ خریدنے گئے ہیں رات کے کھانے کے لئے'' مایا نے روتے روتے جواب دیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر واپس اپنے گھر چلی جاؤں۔ میں نے مایا کو تسلی دی اور اُس کے لئے خریدے ہوئے تحفوں کی تفصیل بتانے لگی۔ وہ تھوڑی بہل گئی تھی۔ میں نے اُس سے کہا کہ سارہ سے بات کرواؤ۔ تھوڑی دیر تک سارہ کو سمجھایا تو وہ اُس کی مدد کے لئے رضامند ہوگئی۔ اتنے میں انور بھی گھر میں داخل ہو گئے تھے۔ مغرب کی نماز کے بعد میں نے اُن سے تفصیلی بات کرنے کا وعدہ کیا اور فون رکھ کر وضو کے لئے باتھ روم کی طرف چلی گئی۔

نماز میں بھی دل بہت بوجھل تھا۔ تھوڑی تازہ ہوا کے لئے بالکونی میں آئی تو اپنی میزبان خاتون کو اُن کے خاندان کے ساتھ کہیں باہر جاتے دیکھا۔ وہ گاڑی سے

اُتر کر اندر کی جانب سے بڑے دروازے کا لاک چیک کر رہی تھیں۔ اس آہنی دروازے کے کناروں کی لائیٹ آج بہت دھیمی جل رہی تھی ساتھ ہی لاک بھی شاید خراب تھا۔ آج ہی میں نے انہیں ایک ملازم کو آہنی دروازے کا آٹومیٹک لاک چیک کروانے کا اطالوی زبان میں کہتے سنا تھا، جس کا ترجمہ کر کے انہوں نے مجھے بھی بتایا تھا اور کہا تھا کہ اگر میں گاڑی سے کہیں جاؤں تو ڈرائیور کو یاددہانی کروادوں کہ بڑے گیٹ کا آٹومیٹک لاک خراب ہے لہٰذا وہ ایک بار گاڑی سے اُتر کر ریموٹ کے بغیر خود چیک کر لے اور تسلی کر لے کہ گیٹ درست بند ہوا ہے کہ نہیں۔ بچوں نے گاڑی کے اندر سے میری طرف دیکھ کر خدا حافظ کرتے ہوئے ہاتھ ہلایا تو جواباً میں نے بھی مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلا دیا۔

میں نے نیچے جا کر کافی بنائی اور واپس اوپر آ کر لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گئی اور کام کرنے لگی۔ نو دس بجے کے قریب بہت زوروں کی بھوک محسوس ہوئی تو کچھ بسکٹ اور صبح یونیورسٹی میں خریدا ہوا ایک بن جو اب تک بیگ میں تھا نکال کر کھا لیا۔ آج رات کھانا کھانے کے لئے جانے کا کوئی موڈ نہیں تھا۔ رات گیارہ بجے کے قریب یاد آیا کہ آج تو تہہ خانے میں موجود لائبریری جا کر معائنہ بھی کرنا تھا۔ جلدی جلدی لیپ ٹاپ بند کر کے اور ٹارچ لیکر تہہ خانے کی سیڑھیاں اُتر کر نیچے آ گئی۔ ایک تنگ سی راہداری کے اطراف میں تہہ خانہ تین بڑے کمروں میں بٹا ہوا تھا۔ پہلے کمرے میں داخل ہو کر میں نے سوئچ تلاش کر کر لائٹ جلائی۔ یہ کمرہ بچوں کے کھلونوں اور خاکی دھاری دار رنگ کے بند ڈبوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے پہلے دن اسی طرح کا ایک ڈبہ ایک عورت کو اُٹھائے اپنی رہائشگاہ کی جانب آتے دیکھا تھا۔ شاید یہ دوائیوں کے ڈبے تھے۔ کمرے میں عجیب سی بو تھی۔ میں نے لائٹ بند کر کے دوسرے کمرے کی جانب رخ کیا۔ دوسرے کمرے کا لاک گھمایا تو محسوس ہوا کہ ہینڈل زرا سا خراب ہے۔ مگر زرا سا دھکا دینے پر یہ کمرہ کھل گیا۔ یہاں درمیان میں بڑی سی ٹیبل ٹینس کی

میز پڑی تھی اور اِدر گرِد کافی اونچی دیو قامت الماریاں گرد میں اٹی ہوئی تھیں۔لگتا تھا کہ یہاں کافی دنوں سے صفائی نہیں ہوئی ہے۔ میں نے الماریاں کھول کر دیکھنا مناسب نہیں سمجھا اور کتابوں کی تلاش میں آخری کمرے میں داخل ہوکر سوئچ تلاش کرنے لگی۔ٹارچ کی روشنی میں کمرہ خاصا پُراسرار لگ رہا تھا۔ میں نے سوئچ بورڈ پر لگے دونوں بٹن دبا دیئے۔کمرہ اچھا خاصا روشن ہوگیا تو مجھے بھی زرا سکون ہوا۔ یہ کمرہ قدرے صاف ستھرا تھا اور یہاں ہی اُن عظیم کتابوں کا خزانہ موجود تھا جن کا ذکر میری میزبان خاتون نے کیا تھا۔ کتابوں کو شیلف میں عنوانات اور زبان کے تحت قرینے سے سجایا ہوا تھا۔اوپر تک پہنچنے کے لئے شیلف کے کنارے ایک سیڑھی لگی ہوئی تھی۔ کچھ کتابیں جلد کی رنگت اور نمبروں کے حساب سے ترتیب سے لگائی گئی تھیں اور کہیں حروف تہجی اور مصنفین کے ناموں کے حساب سے شیلف میں جمان تھیں۔ ''کالا جادو'' ایک شیلف پر اس عنوان کی تختی لگی تھی۔ میں نے شیلف میں نگاہ ڈالی۔کالے جادو اور اس سے منسلک متعلق لوگوں کے مذہبی عقائد اور ممالک پر کئی زبانوں میں کتابیں لگی ہوئی تھیں۔ان کتابوں کے ٹائیٹل عجیب خوفناک سے تھے۔میں نے اپنی توجہ دوسری جانب کی اور '' ایشیائی ادب وثقافت'' کی تختی لگے شیلف کی جانب بڑھ کر رائیٹر اور عنوان کے حساب سے کچھ کتابیں نکالیں اور واپس لائٹ بند کر کے اوپر آنے لگی۔ میرے ہاتھوں میں کتابیں تھیں اس لئے ٹارچ بغل میں دبا لی تھی۔ اچانک سیڑھی کی لائیٹ بند ہوگئی۔ میں نے جلدی سے کتابیں سیڑھیوں پر ہی رکھ کر ٹارچ جلائی۔ میں تھوڑا بہت ڈر پہلے ہی محسوس کر رہی تھی۔ اچانک لائیٹ بند ہونے پہ لگا کہ دل اچھل کر حلق میں آ اٹکا ہے۔ منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی تھی۔کتابیں نیچے ہی سیڑھیوں پر چھوڑ دیں اوبھاگ کر اوپر آ گئی۔ اوپر آتے ہی جیب سے فون نکال کر انور کا موبائیل نمبر ملا دیا۔دوسری طرف سے انور کی نیند میں ڈوبی آواز آئی۔'' کیا ہوا سب خیریت ہے۔۔۔اب دیر ہوگئی تھی تو میں فون نہیں کر سکا۔۔۔ میری آواز

گھبراہٹ میں ٹھیک سے نہیں نکل رہی تھی ۔انور نے ہیلو۔۔ہیلو کہا اور دوبارہ پوچھا۔'' سیمی !! سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟ میں نے گھگھیاتے ہوئے کہا انور لائیٹ چلی گئی ہے میں کیا کروں۔۔۔مجھے ڈر لگ رہا ہے۔میں نے اپنی ساری بہادری کے اُن دعوؤں کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے کہا جو میں اکثر کہتی ہوں کہ مجھے ڈر ورکسی سے نہیں لگتا سوائے اللہ کی ناراضگی کے۔۔۔میں سارے مسائل کا سامنا اکیلے آرام سے کر سکتی ہوں۔مگر اس صورتحال میں صرف بتی گُل ہوجانے پر میرے اوسان ہی خطا ہونے لگے تھے۔انور نے ہنستے ہوئے کہا کہ'' میں کوئی واپڈا یا بجلی کے محکمے سے نہیں ہوں محترمہ ! آپ نے غلط جگہ نمبر ملایا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔سچ سچ بتاؤ کہ میں یاد آرہا تھا۔۔اتنے دن ہوگئے ہیں شادی کو۔۔اور تم ہو کہ اب تک شرماتی ہو'' ۔انور نے بہت رومان پرور ہوتے ہوئے کہا۔مجھے غصہ آگیا۔'' ارے میں سچ کہہ رہی ہوں مجھے ڈر لگ رہا ہے اس اندھیرے بھوت بنگلے میں'' میں نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔اب کی بار انور کی بھی شاید نیند غائب ہوگئی۔انہوں نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا'' اچھا تم گھبراؤ نہیں۔۔۔فوراً اپنی میزبان کو فون کرو اور اُن کو بتاؤ کہ یہاں اچانک لائیٹ چلی گئی ہے، وہ برائے مہربانی چیک کروالیں یا پھر تمہیں اپنی طرف بُلوالیں، چلو شاباش پریشان مت ہو۔۔اور اپنے کمرے میں ہی رہو۔گھبراؤ بالکل نہیں۔۔میں فون بند کرتا ہوں دو تین منٹ میں دوبارہ بات کرونگا تم جلدی سے اپنی میزبان کو فون کرو۔انور سے بات کر کے مجھے خاصی ڈھارس ہوئی۔میں نے اگلے ہی لمحے اپنی میزبان خاتون کا موبائیل نمبر ملایا۔ وہ جاگی ہوئی تھیں۔میرے گھبرائے ہوئے لہجے پر انہوں نے مجھے تسلی دی کہ گھبراؤں نہیں ابھی کچھ دیر میں لائیٹ آجاتی ہے۔اور واقعی پانچ دس منٹ کے بعد لائیٹ آگئی۔میں نے شکر کا سانس لیا اتنی دیر میں انور کا فون آگیا تو میں نے اُن کو بھی سارا واقعہ سنایا کہ تہہ خانے کے ماحول کی وجہ سے بھی میں بوکھلا گئی تھی۔اُس رات انور صبح چار پانچ بجے تک مجھ سے باتیں کرتے رہے اور تسلی

دیتے رہے کہ اب صرف دو تین دنوں میں میری واپسی ہے اور تھوڑا سا صبر ہم دونوں کے لئے ضروری ہے۔

اس رات کے واقعہ کے بعد میں رات کو اُس تہہ خانے میں کبھی نہیں گئی البتہ اگلی صبح ہی سیڑھیوں پر سے کتابیں اُٹھا کر اپنے کمرے میں لے آئی اور دن کی روشنی میں ایک آدھ بار اُس کُتب خانے کی کئی مایہ ناز کتابیں نہ صرف مستعار لیں بلکہ کچھ جرمن زبان کے انمول خزانے اپنے ساتھ برلن بھی لیکر آئی۔

گھر کی یاد

مجھے اٹلی آئے دو ہفتے ہو چلے تھے۔ رفتہ رفتہ گھر کی یاد، بچوں سے دوری اور انور کی محبت مجھے اپنی طرف کھینچنا شروع ہوگئی تھی۔ دن تو الفاظ و زبان کے سُراغ اور تحقیق میں گزر ہی جاتا تھا مگر شام چھ بجے کے بعد سے اس محل کا یہ کمرہ بلکہ یہ پورا حصہ میرے لئے قفس کی دیواروں سے کم نہیں ہوتا تھا۔ میرا اسفراب واپسی کی طرف شروع ہونے والا تھا۔ میں نے یہاں درخواست دی تھی کہ میں اپنی بیٹی سارہ کی چودھویں سال گرہ اُس کے ساتھ منانا چاہتی ہوں جس کی وجہہ سے میں سیمنار ختم ہوتے ہی برلن کے لئے روانہ ہونا چاہتی ہوں اور یونیورسٹی کی جانب سے منعقد کردہ ''ون ڈے سٹی ٹور'' میں شرکت نہیں کر سکتی۔ میری درخواست کو بنا کسی حیل و حجت کے قبول کر لیا گیا۔ ایک بار پھر میں اٹلی میں خاندان کی اہمیت کے حوالے سے بہت متاثر ہوئی ورنہ مجھے یاد ہے کہ ہمارے یہاں جرمنی میں بچے والے افراد جب نوکری کے لئے درخواست دیتے ہیں تو بچوں کی ذمہ داریوں سے متعلق ایک الگ سوالنامہ جاب کے انٹرویو میں ہوتا ہے، بلکہ چھوٹے بچوں کی ماؤں کو جاب کے سلسلے میں اکثر ناکامی کا ہی سامنا رہتا ہے۔ اسٹوڈنٹ لیول پر بھی حالات کچھ بہتر نہیں ہیں وہاں بھی لوگ خصوصاً طالبات مائیں سہولتیں حاصل نہیں کر پاتی ہیں سوائے اس کے کہ دورانِ حمل یا پیدائش

کے بعد چھ ماہ کی چھٹیاں ورنہ لازمی مضامین کی پوری کلاسیں لینا اور وقت پر امتحان دینا ضروری ہوتا ہے۔ مجھے ایک بار پھر برلن کی فری یونیورسٹی کے اسلامک اسٹڈیز کا ایک سیمنار یاد آرہا ہے جو صبح آٹھ بجے شروع ہوتا تھا اور میرے مضمون کا لازمی حصہ تھا۔ چند ماہ کی سارہ کو سردیوں کی اندھری صبح صبح روتے بلکتے کنڈر گارٹن چھوڑ کر جاتے ہوئے میرا دل بالکل بھی کلاس میں نہیں لگتا تھا۔ وہ بھی اپنا گرم بستر کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی اور اپنا ٹیڈی بیئر بازوؤں میں دبائے رو رو کر اپنا بُرا حال کر لیتی تھی۔ میں نے اسلامک اسٹڈیز کی چیر پرسن کو درخواست دی کہ یہی سیمنار دن کے کسی دوسرے حصے میں دہرادیا جائے یا ایک گھنٹہ دیر سے مجھے آنے کی خاص اجازت دی جائے۔ مگر میری درخواست کے جواب میں مجھے کہا گیا کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ چیر پرسن کی سیکٹری نے مجھے زبانی سمجھایا کہ عورتوں کو اپنے مستقبل پر نظر رکھنے کے لئے اور اسے مظبوط بنانے کے لئے خاندانی ذمہ داریوں سے مبرا ہونا بہت ضروری ہے۔ اب جبکہ میں یہاں ایک خاندان اور بچے کی ذمہ داری لے ہی چکی ہوں تو فی الحال گھر دیکھوں اور بچہ پالوں اور یونیورسٹی اور شعبہء تعلیم کا وقت اور سرمایہ برباد نہ کروں۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے یونیورسٹی کے کسی عہدے دار سے پہلی بار نہایت غصے میں بلند آواز بات کی تھی۔ جس کے نتیجے میں سارے ڈپارٹمنٹ میں چند ایک نوجوان طالبات مائیں ملکر چانسلر کے پاس درخواست لیکر گئیں تھیں لیکن کوئی خاص فائدہ نہ ہوسکا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جب میں پبلک ریلیشن سے وابستہ ایک جاب کے لئے انٹرویو دے رہی تھی تو اس ادارے کے منتظم اعلیٰ نے انٹرویو کے دوران سوال کیا کہ میں دو بچوں کو تو جنم دے چکی ہوں اور اب مزید کتنے بچے فیملی پلاننگ میں موجود ہیں؟ وہاں بھی مجھے اُن کے اس ذاتی سوال پر اعتراض ہوا تھا جس کے جواب میں جاب نہیں ملی۔ مگر کچھ لوگوں کا تو کہنا ہے کہ جرمنی کے کئی اداروں میں خواتین کی جاب کیلئے انٹرویو کے دوران جنسی احتیاطی تدابیر اور خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق نہایت کھل کر

سوالات کئے جاتے ہیں اور یہ ادارے ایسے سوالات کرنے کے لئے حق بجانب ہیں۔

مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ اس قسم کے قوانین بنانے والی اور اُن کو لاگو کروانے والی زیادہ تر خواتین ہی ہیں۔ مگر اِن میں اکثریت اُن خواتین کی ہے جن کی اولادیں یا تو بڑی ہو چکی ہیں یا سراسر وہ اولاد کو جنم دینے یا اُس کی تربیت کرنے کے مرحلے سے نہیں گزری ہیں۔ افسوس کہ عورتوں کے ساتھ عورتوں کا یہ رویہ شاید بین الاقوامی ہے اور عورتوں کے ہاتھ عورتوں کا استحصال بھی۔ بہر حال میں بہت خوش اور مطمئن ہوں کہ مجھے اس بات کا کم از کم شعور ہے اور میں اس کے خلاف اکثر مختلف اداروں کے پلیٹ فارم سے اور نجی طور پر بھی سرگرمِ عمل رہتی ہوں۔

Prof. SHARIB RUDAULVI
COLLECTION

آخری دنوں کی مصروفیات

سیمنار اپنے آخری مراحل میں تھا۔ میری تحقیق اور تالیف کا یہ حصہ بھی مکمل ہو رہا تھا۔ ایک بہترین تجربے، ایک کثیر گفت وشنید اور بحث ومباحثہ اور طویل مطالعہ کے بعد اُس روز میں اپنا مقالہ پڑھنے کو تیار تھی۔ سارے لیکچر کو اے بی اور سی کے پوائنٹ بنا کر رکھے ہوئے تھے، پوڈیم کی سطح پر کاغذ ترتیب سے رکھ دیئے تھے میری باری آنے ہی والی تھی۔ سچ پوچھئے تو اُس روز گھبراہٹ بھی بہت تھی۔ زبان وادب کے حوالے سے تلاش کئے گئے اُن حقائق کو تاریخی دلائیل کے ساتھ بیان کرنا تھا جس پر مستقبل کے تحقیق کی بساط جمائی جاسکے۔ میں اپنے موبائیل فون کی گھنٹی بند کر چکی تھی مگر سوئچ آف کرنا بھول گئی تھی۔ اچانک ہلکی سی ارتعاش کوٹ کی جیب میں محسوس ہوئی۔ میرے لیکچر کا آغاز ہونے ہی والا تھا۔ میں نے جلدی سے فون نکال کر دیکھا انور کا فون تھا میں ابھی دبے لفظوں میں کہنا چاہ رہی تھی کہ میں آدھے ایک گھنٹے میں رنگ بیک کرتی ہوں مگر اس سے قبل ہی انور نے سوال داغ دیا کہ برتن دھونے کی مشین کس پروگرام پر چلتی ہے اے پر، بی یا سی پر۔۔۔۔ کچھ لمحوں کے لئے میں اپنے لیکچر میں دینے والے تاریخی دلائیل کی لسٹ کو بھول کر کپڑے دھونے اور برتن دھونے کی مشین کے پروگراموں کا خاکہ ذہن میں بنانے لگی اور اچانک ''اے'' کہہ کر فون سوئچ آف کر دیا۔

اب آپ اس واقعہ کے ذکر سے سمجھیں گے کہ میرے شوہرِ نامدار خالصتاً پاکستانی مرد ہیں جو کہ گھر داری سے دور صرف ''زرداری'' تک محدود ہیں۔ جی نہیں! ایسا ہرگز نہیں ہے۔ میرے ''شوہرِ نامدار سید انور ظہیر رہبر'' ایک نہایت نفاست پسند سلجھے ہوئے اور سلیقہ مند انسان ہیں۔ گھر کی سجاوٹ میں رنگوں کی میچنگ کا عمل دخل اتنا کہ میرے برادرِ نسبتی سید سرور ظہیر غزالی کبھی کبھی مذاقاً کہتے ہیں کہ ''سیما! انور کی زندگی میں گھر کے اندر بدرنگ میچنگ اور کچے رنگوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے تم زرا اس بات کا خیال رکھنا ورنہ۔۔۔۔ عقل مند کو اشارہ کافی ہے''۔ مگر رنگوں کی مناسبت کو میں نے زندگی کے ہر ڈھنگ میں اب اس طرح گھول دیا ہے کہ بدرنگ میچنگ کے ساتھ زندگی گزارنے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہی ہے۔ میں انور کے ساتھ چار سال تک منگنی کے رشتے سے جڑی اپنا گھر سجانے کا خواب دیکھتی رہی اور میرے لئے اپنے خاندان کا استحکام اور یکجہتی میرا اولین فرض رہا ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ہے کہ میری زندگی کے ہر قدم پہ اُسکا کرم شاملِ حال رہا۔ اُس نے اُن تمام خوابوں کو تعبیر دی جو میں نے انور کی محبت میں دیکھے تھے، وہ تمام سپنے کہ میں انکے لئے اپنا گھر سجاؤں ،خود کو سنواروں، انور کے لئے مزے مزے کے کھانے بناؤں، اُن کے کپڑے جوتوں کا انتخاب کروں، اُن کے بال بناؤں۔۔۔۔ آہ!!! بال بناؤں۔۔۔ بس یہی ایک سپنا شادی کے دو چار سالوں بعد ایسا ٹوٹا کہ۔۔۔ مگر وہ بے چارے پھر بھی سرجیکل ہیر پلانٹیشن کا سہارا لیکر میرا یہ سپنا بھی پورا کرنا چاہتے ہیں۔ میں خود ہی اب منع کر دیتی ہوں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک رومان پرور اور خواتین میں مقبول شاعر ہیں میں سوچتی ہوں کہ اگر اُن کے بال لگ گئے تو شاید میرے ہوش اُڑ جائیں۔ بہر حال یہ تو ایک مذاق تھا۔ مگر حقیقتاً سارہ اور مایا میری ازدواجی زندگی کا حقیقی سرمایہ ہیں اور میرے تمام خوابوں کی تعبیر کا منہ بولتا ثبوت بھی۔ جس پر میں جتنا فخر کروں کم ہے اور جس کے لئے میں اپنے رب کا جتنا بھی شکر ادا کروں وہ بھی کم ہے۔

اُس روز سیمنار کا آخری دن تھا۔ میرے ساتھ ساتھ اور دوسری زبانوں کے نمائندہ گان بھی وہاں موجود تھے۔ ہم سب کے کورس اور سیمنار بہت خوبی کے ساتھ انجام کو پہونچے تھے۔ اُس دن جرمن، اٹالین اور پاکستانی کمیونٹی کی جانب سے بھی کچھ لوگ وہاں موجود تھے۔ جن میں اقوامِ متحدہ اور وہاں کے سرکاری کچھ لوگوں نے اپنا تعارف کروایا جو پسماندہ ممالک میں زبان و تعلیم کے فروغ کے لئے کام کر رہے تھے۔ طلبہ و طالبات کی بھی ایک اچھی خاصی تعداد وہاں موجود تھی۔ میں سبز اور نارنجی رنگ کے شلوار قمیص میں وہاں موجود تھی جسکے اوپر کالا گاؤن نما کوٹ پہنا ہوا تھا میرے لباس کو اکثر لوگ دلچسپی کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ جس کا اندازہ مجھے ایک جرمن صاحب کے اس سوال سے ہوا کہ میرا لباس اس بات کی نفی کر رہا ہے کہ میں جرمنی کی یونیورسٹی کے پلیٹ فارم سے یہاں آئی ہوں۔ میں نے بھی اُن کو برجستہ جواب دیا کہ وہ فکر نہ کریں میں جرمنی کی طرف سے بحیثیت جرمن شہری یہاں آئی ہوں۔ بس یہاں فٹ بال کی ٹیم کی طرح یونی فارم کی پابندی نہیں ہے جو میرے اس فرق کو واضح کر سکے۔ یاد رہے کہ جرمن فٹ بال ٹیم جس پر جرمنوں کو بہت فخر ہے، میں گنتی کے چند اصل جرمن ہیں باقی تمام کھلاڑی ترکی، پولینڈ اور دیگر ممالک کے نژاد شہری ہیں۔ میری اس برجستگی پر وہ مسکرا دیئے اور میرے مقالے کی تعریف کر کے ہندوستان اور پاکستان میں سیاسی تعلق کے حوالے سے میری رائے جاننے اور کچھ نئی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ پتہ نہیں کیوں ہر یورپین اور امریکی اس بارے میں اتنا تجسس رکھتا ہے جبکہ وہ ہم سے بہتر طور پر آگاہ ہوتا ہے۔ ملک سے باہر رہنے والے ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کو اکثر ایسے مواقع پر محتاط ہو کر جواب دینا ہوتا ہے۔ آخر ہم دونوں ملکوں کے لوگ یہاں خود کو دیسی کہلواتے ہیں یعنی ایک ہی دیس کے لوگ، ایک دوسرے کے بھائی۔ اب بھائی کو بھائی سے کوئی شکایت بھی ہے تو وہ شکایت کسی غیر سے کیوں کریں؟ ہم اپنے مسئلے اپنی شکایات خود بھی تو دور کر سکتے ہیں۔

بہر حال مجھے اُس دن شدت سے احساس ہوا کہ ہمارا قومی لباس ہماری کتنی بڑی پہچان ہے اور ہمارے ظاہر و باطن کی کتنی واضح تصویر بھی۔

لباس کے معاملے میں اطالوی عورتیں اور مرد دنیا کے جدید اور دیدہ زیب لباس کے استعمال کے لئے مشہور ہیں۔ میلان دنیا میں سٹی آف فیشن کہلاتا ہے۔ یہاں ساری عورتیں اور تمام مرد اپنی وضع قطع کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ فرانس اور اٹلی یورپ میں لباس کی نفاست اور جدت کے لئے بہت مشہور ہیں۔ یہاں بھی جگہ جگہ بیوٹی پارلر اور ہئر ڈریسر سیلون موجود ہیں۔ دنیا کی مشہور اور نامی گرامی کمپنیاں جو میک اپ، پرفیوم اور فیشن ورنگ کی دنیا سے منسوب ہیں، ''میڈ ان اٹلی'' کی مہر کے ساتھ صارفین کے اعتماد، اپنی ساخت اور بہترین کوالٹی کی وجہ سے اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ یورپ کے ایک فیشن میگزین کے ایک سروے کے مطابق جرمنی میں عورتیں اپنی نسوانیت کا سب سے کم خیال رکھتی ہیں۔ لباس اور فیشن اُن کی زندگی کا ثانوی مرحلہ ہے۔ جرمنی کی موجودہ چانسلر انجیلا میرکل کے متعلق ایک لطیفہ مشہور ہے کہ:

سوال ۔ ''کیا کوئی بتلا سکتا ہے کہ چانسلر ڈاکٹر انجیلا میرکل اپنے اولڈ فیشن کپڑوں اور پُرانے جوتوں کا کیا کرتی ہیں؟

جواب ۔ ''وہ انہیں پہنتی ہیں''

ہے نا معصومانہ مختصر اور سچا جواب! مگر اس کے برعکس جرمنی میں لوگ چاہے وہ کسی بھی شعبہ زندگی سے تعلق رکھتے ہوں، قدرتی اور ماحول دوست اشیاء کی خریداری اور استعمال کے لئے آرگینک شاپ جاتے ہیں اور دیسی طریقہ استعمال کو فوقیت دیتے ہیں۔ ماحول کی حفاظت اور دوستی میں یہ دنیا کی سرفہرست قوموں میں سے ہیں۔ یہ لوگ ماحول کو کیمیائی آلودگی سے بچانے اور قدرتی عوامل سے دنیا اور انسانی زندگی کا حسن بحال رکھنے میں دن رات کوشاں ہیں۔ حفظانِ صحت کے لئے جڑی بوٹیوں سے علاج ہو یا بچے کی پیدائش و پرورش میں قدرتی اصولوں کا اطلاق، جرمن اس عمل میں

سب سے آگے ہیں۔ جب اصل پر توجہ زیادہ ہو تو نقل پیچھے رہ ہی جاتی ہے۔

میری میزبان خاتون اُس روز میرے ساتھ تھیں۔ گھر کی جانب سفر کرتے ہوئے انہوں نے میری خود اعتمادی اور میری محنت کو بہت سراہا۔

میں بہت خوش تھی۔ میں نے اُن سے درخواست کی کہ مجھے وہ راستے میں کہیں بازار کے پاس اُتار دیں تا کہ میں صبح واپسی کے لئے کچھ تحائف اور ضروری چیزیں خرید سکوں۔ وریسے میں ہی ایک شاپنگ سینٹر کے پاس انہوں نے مجھے اُتار دیا اور خود شاید اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئیں۔ میں نے انور اور بچوں کے لئے کچھ تحائف خریدے اور اپنے لئے کچھ چیزیں پسند کیں۔ وہیں ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اس سڑک پر کچھ مناظر کی تصاویر بنائیں اور رات آٹھ نو بجے کے قریب اپنے بھوت بنگلے میں داخل ہوئی۔ میری میزبان خاتون دروازے پر ایک چٹ لگا رکھی تھی کہ گھر آ کر رابطہ کروں۔ میں نے اُن کو فوراً فون کیا تو انہوں نے کہا کہ میں اور میری فیملی تمہیں خدا حافظ کہنے کے لئے ملنا چاہتے ہیں اور دس منٹ میں وہ لوگ میری طرف آ رہے ہیں۔

میں نے جلدی جلدی کمرے میں رکھے شاپنگ بیگ سمیٹ کر ایک جگہ رکھے اور بال درست کرتے ہوئے مہمان خانے کی طرف چلی گئی۔ چند منٹ کے بعد پانچوں بچے اور میاں بیوی میری طرف آ گئے۔ اُن کے ہاتھوں میں میری فیملی اور میرے لئے کچھ تحائف تھے۔

آج میں نے بھی اُن کے بچوں کے لئے کچھ چاکلیٹ لی تھیں اور اپنی میزبان خاتون کے لئے ایک گرم شال بھی۔ ایک پُر خلوص اور دوستانہ ماحول میں ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ تحائف کا تبادلہ کیا، نیک خواہشات کا اظہار کیا اور سب سے چھوٹے بچے سے وعدہ بھی کیا کہ میں واپس جا کر ضرور کسی غریب بچے کی تعلیم کے لئے کوشش کرونگی اور اپنے حصے کا فرض ادا کرنے کی کوشش کرونگی۔ بچہ مسکرا کر اپنی ماں کو اُس دن

کے سوال جواب کے بارے میں بتانے لگا۔ اُن سب نے کچھ دیر بعد مجھے الوداع کہا اور واپس اپنے محل کے رہائشی حصے کی جانب چلے گئے۔ میری میزبان خاتون نے کہا کہ صبح ساڑھے چھ بجے ڈرائیور آجائے گا اور وہ بھی مجھے خدا حافظ کہنے آئینگی۔

اُن سب کے جانے کے بعد میں نے اپنا سوٹ کیس نکالا اور سامان پیک کرنا شروع کر دیا۔ رات کو انور سے لمبی بات چیت کی۔ انہوں نے بورڈنگ کارڈ اور تمام کاغذات وسامان کی پیکنگ کے بارے میں پوچھا اور بتایا کہ شام میں سارہ اور اُسکی دوستوں کو لیکر انڈین ریسٹورینٹ جانے کا پروگرام بنا ہے اور مجھے ائیر پورٹ سے لینے کے لئے انہوں نے کام سے آدھے دن کی چھٹی لی ہوئی ہے۔

رات بارہ بجے میں نے سارہ کو اُس کی سالگرہ کے لئے ایس ایم ایس بھیجا وہ بھی جاگ رہی تھی۔ اُس نے فوراً جواب میں شکریہ لکھا اور ساتھ ہی لکھا کہ میں اور مایا بہت خوش ہیں کہ آپ گھر لوٹ رہی ہوں اور میں بھی اُن کی طرح بہت خوش تھی کہ چند گھنٹوں بعد میں اپنے گھر پہنچ جاؤں گی۔ زندگی کے ایک نئے تجربے کے ساتھ، ایک نئی اُمنگ ایک نئی توانائی کے ساتھ، اور کچھ نئے وعدوں کے ساتھ۔ میں تقریباً روزانہ ہی ڈائری لکھ رہی تھی۔ اُس سفر کی میلان میں گزاری آخری رات کو ہی میں نے سوچا تھا کہ اگر زندگی نے مہلت دی تو اس سفر کی یادداشت کو سفرنامے کی شکل دیکر ضرور شائع کرواؤنگی۔ اُس وقت تو نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ سارا سفر، یہاں قیام، اور یونیورسٹی میں گزارا وقت اور میلان کی گلیوں میں گزرا ایک ایک لمحہ نظروں کے سامنے ایک فلم کی صورت میں چل رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے لائیٹ بجھادی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔

اگلے دن صبح صبح ڈرائیور آگیا میں تقریباً تیار تھی۔ یہ وہی خدمت گار تھا جو مجھے پہلے روز ائیر پورٹ لینے کے لئے آیا تھا۔ اُس نے نہایت گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ اشاروں کی زبان میں حال چال پوچھا جس کے بعد اُس نے میرا سامان نیچے

اُتارنے میں مدد کی اور خود گاڑی میں رکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد میری میزبان خاتون بھی جاگنگ سوٹ میں دوڑتی ہوئی عمارت کے عقبی رستے سے آتی دیکھائی دیں۔ میں نے صبح کے سلام کے بعد ایک بار پھر اُن کی پرخلوص مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے بھی میری رہائش کے دوران اُردو سکھانے کا شکریہ ادا کیا اور کہیں جانے ان جانے میں ہونے والی غلطیوں اور کوتاہیوں کی معذرت کی۔ میں نے اُن کو گلے لگالیا۔ ایک عجیب اپنائیت کا احساس محسوس ہوا۔ وہ میرے ملک وقوم کے غریب بچوں کی تعلیم اور صحت کے لئے اس قدر کوشاں تھیں اس حوالے سے بھی ہمارا ایک تعلق تھا۔ میں اُن کی بہت ممنون تھی اور ہمیشہ رہوں گی۔

میں گاڑی میں بیٹھ گئی کچھ دیر بعد میں ائیر پورٹ پہنچ کر سامان ائیر لائین کے کاؤنٹر پر دیا اور اس کے لاؤنج میں بیٹھ کر ائیر برلن کے طیارے کا انتظار کرنے لگی۔ ان دنوں جرمنی میں ماحول کے تحفظ کے عنوان سے ایک کانفرنس ہونے والی تھی۔ لاؤنج میں بیٹھے کئی لوگ اس کانفرنس میں ایک وفد کی صورت میں جارہے تھے۔ ان میں سے بیشتر افراد جرمن نژاد اٹالین لگ رہے تھے اور بڑی روانی کے ساتھ جرمن زبان میں جرمنی کے ماحول کے تحفظ پر میں گفت وشنید کر رہے تھے اور وہاں کے ماہرین کی قابلِ عمل تجاویز کو سراہ رہے تھے۔ اُن کی باتیں سن کر مجھے بہت فخر محسوس ہو رہا تھا کہ میں پاکستان کی زبان وثقافت کی امین ہونے کے ساتھ ساتھ اُس ملک کی بھی شہری ہوں جو اس دنیا کو آلودگی سے پاک ماحول فراہم کرنے کے لیے دنیا کے اولین ملکوں میں شامل ہے۔

برلن کی جانب جہاز اُڑنے کے کچھ دیر بعد مجھے ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے کراچی جاتے وقت کیفیت جذباتی ہو رہی ہوتی ہے۔ خوبصورت پہاڑوں اور سمندروں کے اوپر سے دیکھتے ہوئے میں قدرت کے اس عظیم شاہکار ''دنیا'' اور اس میں بسنے والے انسانوں اور اِسکے ورثے یعنی زبان وثقافت، ماحول اور دیگر

شعبہء زندگی میں اُسکی حفاظت اور ترقی کے بارے میں سوچ رہی تھی اور ساتھ ساتھ خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ ابھی کرہء ارض پر کچھ لوگ ہیں جو خدا کے اس عظیم شاہکار کے نہ صرف معترف ہیں بلکہ اس کو حفاظت کے ساتھ پروان چڑھانے میں بھی اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔

سفرنامہ

اٹلی کی جانب گامزن

عشرت معین سیما

عشرت معین سیما کا مقام پیدائش کراچی ہے اوران کی زندگی کے دو ڈھائی عشروں پر مبنی تعلیم وتربیت کی آماجگاہ بھی۔ وہ برلن میں گذشتہ تیئس سال سے مقیم ہیں۔ انہوں نے پاکستان میں دوران تعلیم ہی اپنی صحافتی سرگرمیوں کا آغاز کردیا تھا۔ کراچی میں نوائے وقت کے ساتھ ڈھائی سال کام کرتے ہوئے انہوں نے ۱۹۹۰ میں کراچی یونیورسٹی سے ابلاغ عامہ میں ایم اے کیا۔ اس دوران اخبار میں خبروں کے ساتھ ساتھ ان کے افسانے اور دیگر مضامین بھی شائع ہوتے رہے۔ کالج کے زمانے سے ہی شاعری کے میدان میں انعامات حاصل کرتی رہیں۔ برلن میں پاکستانی سفارتخانے اور ایک ادبی تنظیم کی جانب سے سند سپاس حاصل کی۔ اس کے علاوہ جرمن پاکستان فورم کی جانب سے بھی اردو ادب کی خدمات پر خصوصی انعام حاصل کیا۔

ان کا پہلا افسانہ دلشاد نسیم صاحبہ کی حوصلہ افزائی پر ۱۹۸۵ میں خواتین کے ایک ڈائجسٹ میں کراچی میں شائع ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ۱۹۹۱ میں انور ظہیر صاحب سے رشتہ ازدواج میں بندھنے کے بعد جرمنی چلی گئی تھیں۔ برلن کی فری یونیورسٹی سے دوسرا ماسٹر انڈیالوجی اور صحافت میں کیا ساتھ ہی برلن کے ایک مقامی اخبار برلینر سائیٹونگ کے ساتھ وابستہ رہیں اور اپنے ایک جرمن پروفیسر کے ساتھ یونیورسٹی ریڈیو برلن کی بنیاد رکھی۔ آج بھی کبھی کبھار جرمن زبان میں اسی ریڈیو سے ر کلچر پروگراموں میں شامل رہتی ہیں۔ انڈیالوجی میں ماسٹر کے دوران اپنے ایک پروفیسر نیپال جو ساؤتھ ایشین ۳۲ زبانوں پر دسترس رکھتے تھے اور بالخصوص ہندی اور اردو پر انکی نظر خاص تھی کی سرپرستی میں برلن میں پہلا اردو ادبی جریدہ نئی کاوش کے نام سے جاری کیا۔ جس میں اساتذہ اردو ادب کے ساتھ ساتھ نئے لکھاریوں کو بھی متعارف کروایا۔

۱۹۹۹ء میں بحیثیت معاون اردو ٹیچر کے فرائض فری یونیورسٹی میں ادا کئے اور ۲۰۰۰ء میں یورپی یونین کے تحت ایک یوروایشیاء لینگوج سینٹر میں پاکستان اور اردو کی انچارج کے عہدہ پر کام کیا جسے بعد میں وفاقی امور خارجہ کی تحویل میں لے لیا گیا۔ اس دوران اردو کی تدریس کے ساتھ ساتھ ادبی سرگرمیوں کو بھی فروغ دینے کا موقع ملا۔ عصمت چغتائی کی تصانیف اور بالخصوص انکے ناول ٹیڑھی لکیر پر سیر حاصل تبصرے نے خاصی مقبولیت حاصل کی۔ بعد میں عورت کا اردو ادب میں مقام اور ترویج و ترقی میں کردار کے حوالے سے سیر حاصل مقالہ تحقیق وترتیب دیا جسے اردو انجمن کے پلیٹ فارم سے بھی پیش کرنے کا موقع بھی فراہم کیا گیا۔

۲۰۰۵ء سے اردو الیکٹرونک میڈیا جیو، اپنا اور بی بی سی اردو لندن کے لئے کام کیا۔ اس سے قبل کچھ عرصے تک اردو سروس جرمنی کے انٹرنیٹ صفحے پر اپنی صحافتی کارکردگی کا مظاہرہ پیش کیا۔

۱۹۹۱ء کے آخری ماہ سے اب تک نجی اور بزم ادب برلن اور اردو انجمن برلن کی جانب سے منعقد کئے گئے مشاعروں میں باقاعدگی سے حصہ لیا اور بیشتر مشاعروں کی نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ اخبار جنگ، عالمی اخبار، پرواز اور دیگر رسائل میں اپنی نگارشات گاہے بگاہے شائع کرواتی رہی ہوں۔ گذشتہ پانچ سال سے اردو انجمن برلن کی فعال رکن ہیں اور ساتھ ہی یورپ کی ایک یونیورسٹی کے شعبہ لسانیات میں جرمن زبان کے جنوبی ہند کی زبانوں کے ساتھ تعلق میں اردو اور ہندی زبان کی تاریخ اور ارتقاء کے حوالے سے تحقیق کی اور اٹلی کے شہر میلان میں اسی منصوبے کے تحت میں اردو زبان کو یونیورسٹی لیول پر نا صرف متعارف کروایا بلکہ یورپی یونین کے شعبہ لسانی تحقیق پر انعام بھی حاصل کیا۔ اس وقت برلن یونیورسٹی کے ایک ریسرچ سینٹر میں تحقیق وتدریس کے امور پر بھی فائز ہیں۔